# قائدِ ملت

## نواب بہادر یار جنگ مرحوم

### حالاتِ زندگی

غلام محمد بی اے (عثمانیہ)

نفیس اکیڈیمی
عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن

قیمت دو روپیے بارہ آنے کلدار
تین روپیے چار آنے سکہ ع

طبع اوّل — ایک ہزار
جنوری ۱۹۴۶ء
مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

# فہرست

# میرا محسن — مردِ مومن

میں اپنے محترم دوست کا مشکور ہوں (جنہوں نے اپنے نام کے اظہار کی اجازت نہیں دی) کہ انہوں نے حضرت قائدِ ملت مرحوم سے متعلق میرے جذبات عقیدت و محبت کو خوبصورت الفاظ کا جامہ پہنا کر آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔

چودھری محمد اقبال سلیم گاہندری

میری زندگی کا وہ چمکیلا دن جس دن علامہ عبدالقدوس ہاشمی نے اسلامیان ہند کے بطل عظیم قائدِ ملت حضرت محمد بہادر خاںؒ سے میرا تعارف کرایا تھا ایک ناقابل فراموش اور یادگار دن ہے۔ اس دن کی درخشندگی آج تک بھی میری زندگی کو تابندہ بنائے ہوئے ہے قائدِ ملت نے اس دن مجھے ایسی نظروں سے دیکھا تھا جس کا مفہوم اس وقت میری سمجھ سے باہر تھا۔

پھر ایک دن ایسا بھی آیا جس دن میں قائدِ ملت کی دور رس و قیافہ شناس نظروں کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ پہلی ملاقات میں میں کیا جانتا تھا کہ قائدِ ملت اپنی نظر کی کسوٹی پر مجھے جانچ رہے تھے۔

دارالاشاعت سیاسیہ سے میرا تعلق منقطع ہو گیا تھا اور میں حیدرآباد کی زندگی میں ایک بے یار و مددگار، نت نئی پریشانیوں میں گرفتار، غریب الوطنی کا شکار، حوادث سے

دست تگریباں تھا۔ اپنے، اپنے نہ رہے تھے۔ دوست، دوست نہ رہے تھے۔ زندگی ڈراؤنی نظر آرہی تھی۔ مستقبل گھناؤنا دکھائی دیرہا تھا۔ مصیبت امتحان وفا لے رہی تھی۔ چشم حریف تماشہ بیں تھی۔ اور میں یکہ و تنہا تھا۔ پریشان و ہراساں تھا۔ اقبال کا اقبال گھنایا ہوا تھا۔ آزمایش کے اس کٹھن وقت میری ثابت قدمی کو دیکھ کر قائد ملت کا سایہ عاطفت مجھے اپنی پناہ میں لیتا ہے۔ اور حوادث کو شکست ہوتی ہے۔ چشم حریف نیچی ہو جاتی ہے اور قائد ملتؒ مولوی سید عبدالرزاق صاحب مالک اعظم اسٹیم پریس سے ارشاد فرماتے ہیں۔

"سید صاحب —— آپ اعظم اسٹیم پریس کے مالک ہیں اور پریس قوم کی آواز ہوتا ہے۔ اس آواز کو بلند آہنگ اور موثر بنانے کے لئے میں آپ کو اقبال سلیم کو دیتا ہوں یہ اس فن کا ماہر ہے ——"

یہ کوئی خودستائی نہیں بلکہ حضرت قائد ملت کے ارشادات ہیں اور انکی دوررس و قیافہ شناس نظروں کی ایک مثال ہے۔ حضرت قائد ملت اپنی قوم کے ہر فرد کو خاص خاص امیدوں کی حامل نظروں سے دیکھتے تھے۔ انکی جوہر شناس نظریں اپنی قوم کے افراد کو صرف دیکھتی ہی نہیں تھیں بلکہ ملت اسلامیہ کی مشنری کے لئے اس کے موزوں مقام کا انتخاب کرتی تھیں۔ ان کی غواص نظریں جہاں پڑیں وہاں صدف کے منہ کھل گئے۔ گوہر آبدار برآمد ہوئے۔ ان کے اعجاز نظر نے جس مسلمان کو جو بنانا چاہا وہ بنا دیا۔

یہ حضرت قائد ملت ہی کی بتائی ہوئی وہ صراط مستقیم ہے جس پر میں نے رجحان فطری اور صلاحیت کار کے ساتھ زبان اردو کی خدمت انجام دیتا ہوا مسرور اور کامراں منزل کی طرف رواں ہوں۔ اب بھی ہر دم میری یہی دعا ہے کہ روز حشر میں

اپنے محسن حضرت قائدِ ملت کے سامنے ایسا چہرہ پیش کرسکوں جس پر ان امیدوں کی تکمیل جلوہ فگن ہو جو حضرت مرحوم نے میری ذات سے وابستہ کی تھیں۔

اس سلسلہ میں ہم نے حسب ذیل کتابیں شایع کرنے کا پروگرام مرتب کیا ہے (۱) ملفوظاتِ بہادر یار جنگ (۲) خطباتِ بہادر یار جنگ (۳) بہادر یار جنگ کی سیاسی زندگی

اب یہ پہلی کتاب اسی مردِ حُر کی فقید المثال زندگی کی سوانح ہے جو صرف ایک نیک و صالح زندگی کا مطالعہ ہی نہیں بلکہ ملتِ اسلامیہ حیدرآباد کی تاریخ بھی کہی جاسکتی ہے یہ محض بہادر خاں کی داستان زندگی نہیں ہے بلکہ اقبال کے مردِ مومن کی شاہینی پرواز، قوت حیدری، استغنائے سلمانی، عشق ابراہیمی، فقر شبیری اور نطق ربانی کے کارناموں کا مکمل مجموعہ ہے۔

اس کارگہہ ہست و بود میں ہر روز ان گنت انسان پیدا ہوتے ہیں اور اپنی عمر طبعی کے بعد مر جاتے ہیں۔ مگر بعض ہستیاں ایسی بھی پیدا ہوتی ہیں جنکی زندگی کو دوام حاصل ہوتا ہے۔ قائدِ ملت حضرت محمد بہادر خاں کی ہستی بھی وہی ہستی ہے جو ایک مرتبہ معرض وجود میں آئی۔ اور دنیا کے آخری غروب آفتاب تک درخشندہ و تابندہ رہیگی۔ انسانی پیدائش کے نظام میں انسان تو روز ہی پیدا ہوتے ہیں۔ مگر بہادر خان جیسی ہستی ایک ہی دفعہ پیدا ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بہادر خاں جو ایک تندرست و تنومند جسم بلند و بالا قد۔ سُرخی مائل سفید کتابی چہرے، بھری بھری سی خشخشی داڑھی والا پیکر تھا آج مشیرآباد کے شہر خموشاں میں تہہ قبر ایک ابدی نیند سو رہا ہے مگر وہ بہادر خاں جو علامہ اقبال کا مرد مومن ہے، حضرت جمال الدین افغانی کی تعلیمات اور مولانا محمد علی جوہر کے عزائم کی رُوح ہے آج بھی ہر ہندی مسلمان کے شبستانِ وجود کو گرما رہا ہے اس لئے اس کے جسم کے عناصر کی پراگندگی کو موت کہنا اپنی عقل و دانش کی موت ہے جب تک بہادر خاں کی

یادہندی مسلمانوں کے دلوں میں زندہ ہے بہادر خاں اپنی "جسمانی موت" کے باوجود آج بھی زندہ ہے۔ اور تا ابد زندہ رہے گا

یہ کتاب قائد ملت کی ایک مجمل سوانح ہے جس کو مولوی غلام محمد صاحب بی اے عثمانیہ نے قلم بند فرمایا اور ہم نے اس مرد مومن کے "نمونۂ زندگی" کے طور پر مسلمانوں اور بالخصوص اسلام کی آنے والی نسلوں کے لئے پیش کیا ہے۔ اس نمونۂ زندگی کی تجلی کی ہر ہندی مسلمان کو ضرورت ہے قائد ملت کا ایک ایک نقشِ قدم اس کا رہبر و رہنما ہے۔ انکی زندگی کا نجی سے نجی واقعہ بھی اس کے لئے ایک نشانِ منزل ہے۔

حضرت قائد ملت حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے مگر آپ کا وطن سارا بلاد اسلامیہ تھا۔ کیونکہ بہادر خاں مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ "دکنی کا ہندی کوئی اور ہو تو ہو میرا ہندی اقبال ہے۔" یہ وہی اقبال ہے جس کی تعلیمات نے حضرت قائد ملت کی ہستی میں اپنا تخیلی مرد مومن تخلیق کیا تھا۔ وہ مرد مومن جس کا نعرہ ہے۔

بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ساسانی نہ افغانی

(اقبال رح)

چنانچہ جس طرح

مومن کے جہان کی حد نہیں ہے
مومن کا مقام ہر کہیں ہے

(اقبال رح)

اسی طرح حضرت قائد ملت کو حیدرآباد کی جغرافی حدود میں مقید کرنا مومن کی ذہنیت سے

بعید ہوگا جبکہ قائد ملت نے سارا ہندوستان فتح کرلیا تھا۔ قائد ملت ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے یقیناً ایک بہت بڑے فاتح گزرے ہیں۔ آپ نے تاریخوں میں شمشیر و سناں، توپ و تفنگ والے فاتحین کا ذکر پڑھا ہوگا۔ مگر آپ کو قائد ملت کی تنہا ہستی ایسی نظر آئے گی جس نے اپنے اعجاز نطق سے سارا ہندوستان فتح کرلیا تھا جس کی شعلہ آواز نے خرمن باطل کو جلا دیا تھا جس کے اعجاز خطابت نے ہمارے ہندی مسلمانوں کی سوئی ہوئی غیرت کو جگایا اور سرد لہو کو گرما دیا۔ کیا حلیف و کیا حریف سب جانتے ہیں کہ بہادر خاں نے ہندوستان کے جس خطے میں تقریر فرمائی وہاں کی فضاؤں میں مسلم لیگ کا سبز ہلالی پرچم بڑے کروفر سے لہرایا۔ چنانچہ سرحد کے سنگلاخ زمین میں مسلم لیگ کا پرچم لہرانا حضرت قائد ملت کی سحر خطابت کا ایک حیرت انگیز معجزہ ہے۔ سرحد کی فضا مسلم لیگ کے لئے قطعی طور پر ناساز گار تھی۔ انہی دنوں قائد اعظم محمد علی جناح پر ایک خاکسار نے قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ اور مسٹر جناح نے سردار اورنگ زیب خاں کی عیادت پر جواب دیا تھا کہ "میرے زخم اس وقت تک مندمل نہ ہونگے جبتک سرحد میں مسلم لیگ کو فتح نہ ہو"۔ یہ سنکر قائد اعظم کا دیوانہ پرستار محمد بہادر خاں تڑپ اٹھتا ہے اور سرحد کا سفر کرتا ہے۔ سرحد میں قائد ملت سردار اورنگ زیب خاں[1] کے

---

[1] قبل اس کے کہ مہمان کا تذکرہ کیا جائے نامناسب نہ ہوگا اگر میزبان کے متعلق کچھ کہا جائے۔ سردار اورنگ زیب خاں سرحد کے ممتاز خاندان سادات گیسو دراز کی اولاد سے ہیں اور قبیلہ گنڈاپور کے سادات ہیں سرحدی قبیلے کے صدر کو سردار کا خطاب دیا جاتا ہے۔ سردار صاحب علیگڈھ کے بی اے ال ال بی ہیں اور دوران طالب علمی میں علیگڈھ دیوٹی سوسائٹی کے وفد کی قیادت کرتے ہوئے رنگون بھی گئے تھے۔ علیگڈھ میں آپکو پروفیسر اور طلبا خطیب خوش بیاں کے نام سے پکارا کرتے تھے

(بقیہ صفحہ (۱۱) پر دیکھئے

مہمان ٹھیرتے ہیں۔ انتخاب کی مہم شروع ہوتی ہے اور بہادر خاں بارہ ہزار سے زائد سرحدی پٹھانوں کے پتھر جیسے دلوں کو اپنی نوائے جگر گداز سے پگھلا دیتا ہے اور مسلم لیگ چاروں انتخابات جیت لیتی ہے اور قائداعظم کے زخم مندمل ہوجاتے ہیں

علامہ اقبال رح کا ایک مصرعہ ہے۔

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اور قائد ملت امت اسلامیہ کے وہی جگردار سپاہی تھے جو اپنی زندگی کے آخری سانس تک بے تیغ ہی لڑتے رہے اور ہر معرکہ میں ظفر مندیاں انکے قدم چومتی ہیں

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱) ال ال بی کامیاب کرنے کے بعد پشاور میں وکالت شروع کی ایڈوکیٹ ہوئے۔ سیاسی میدان میں داخل ہوئے صاحبزادہ سر عبدالقیوم کی حمایت سے رکن بنے۔ ۱۹۳۲ء میں بحیثیت سکریٹری گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ سرحد میں مسلم لیگ کے بانی سردار صاحب نے ۱۹۴۲ء میں کانگریسی وزارت کو شکست دی اور مسلم لیگ نے وزارت بنائی۔ سردار اورنگ زیب خاں وزیر اعظم بنائے گئے۔ آپ کی وزارت عظمیٰ کے زمانے میں سرحد میں چار ممبروں کا انتخاب ہوا۔ جناح پر اسی زمانے میں چاقو سے کسی خاکسار نے حملہ کیا تھا جناح نے ٹیلیفون پر سردار اورنگ خاں سے کہا تھا کہ میرے زخم اسی وقت مندمل ہوسکتے ہیں جبکہ چاروں انتخابات مسلم لیگ جیت لے۔ اور یہی ہوا سردار اورنگ زیب خاں کلاچی ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے باشندے ہیں جب یہ چھوٹے سے تھے اسی زمانہ میں یتیم ہوگئے تھے سردار صاحب کے والد سردار محمد یار خاں زمیندار اور رئیس تھے آپ کے بھتیجے سردار عنایت اللہ خاں بی اے ال ال بی (علیگ) کی خدمات حکومت سرکار عالی نے مستعار لی ہیں وہ تقریباً ڈیڑھ سال سے حیدرآباد میں مددگار سٹی پولیس ہیں جب یہ اولاً یہاں آئے تھے تو حیدرآباد کے روہیلے اور پٹھانوں نے انہیں ایک ٹی پارٹی دی تھی جس میں ملک کے ممتاز عہدہ دار شریک تھے

قائدِ ملت کی جراءت رندانہ کے یوں تو کئی واقعے زبان زدِ خاص و عام ہیں لیکن سرحد کا وہ واقعہ جب کہ قائدِ ملت پاکستانی وفد میں سردار اورنگ زیب خاں اور قاضی محمد عیسیٰ صدر مسلم لیگ بلوچستان کے ساتھ سفر کر رہے تھے ایک سنگین ثبوت ہے کہ قائدِ ملت نے اپنے دوستوں کی خاطر اپنی جان کی کبھی پرواہ نہیں کی۔

سرحد میں فقیر ایپی کی ہولناک سرگرمیاں پوری دہشت ناکی سے جاری ہیں سرحد کی سڑکوں پر سفر کرنا موت کی سڑک پر سفر کرنے سے کم نہیں مگر پاکستانی وفد کی موٹر سرحد کی سڑک پر دوڑ رہی ہے تینوں اراکینِ وفد کی زندگی خطرے میں ہے۔ قاضی عیسیٰ موٹر ڈرائیو کر رہے ہیں اور "فقیر ایپی حملے" کے اصول کے مطابق قاضی عیسیٰ ناوک اجل کے پہلے شکار ہیں۔ اسی لئے قائدِ ملت ان کے ہاتھ سے اسٹرینگ لے لیتے ہیں۔ عجیب کشمکش کا عالم ہے۔ قاضی صاحب قائدِ ملت کی جان کو اپنی زندگی سے زیادہ گرانقدر سمجھتے ہیں اور قائدِ ملت فرماتے ہیں "پہلے میں ——" اپنوں کو بچانے کے لئے خود ناوک اجل کی آڑ ہو جانے کا یہ شوق، اللہ اللہ کس قدر جسارت آفریں ہے۔ شاید اجل بھی شرما گئی۔

راستے میں ایک شخص موٹر روک لیتا ہے اور قریب آکر پوچھتا ہے "آپ میں سے بہادر یار جنگ کون ہے ——؟" قائدِ ملت اپنے سینے پر ہاتھ رکھکر جواب دیتے ہیں۔ وہ شخص قائدِ ملت کو فقیر ایپی کا پیغام سنانے تنہائی میں لیجانا چاہتا ہے۔ سردار اورنگ زیب خاں اور قاضی عیسیٰ منع کرتے ہیں کہ اس میں خطرہ ہے۔ مگر بہادر یار جنگ آلِ ابراہیم سے تھے جو آتشِ نمرود کو گلستاں بنا دیتا ہے۔ بہادر خاں بے خطر اس شخص کے ساتھ چلے جاتے ہیں اور آتشِ فقیر یوں گلزار بن جاتی ہے۔

" فقیر صاحب نے آپ کو سلام کہا ہے اور یہ پیغام بھیجا ہے کہ

ہمیں آپ کی یہاں تشریف آوری کی اطلاع تھی اس لئے آپ کے سفر کے انتظامات کر دیئے گئے ہیں۔ آپ جہاں جہاں سفر کرنا چاہیں ہمیں اطلاع دیدیجئے تاکہ وہاں بھی حفاظتی انتظامات کر دیئے جائیں۔"

یہ معجزہ تھا اس ابراہیمی روح کا جسے تاریخ اسلام نے بہادر خاں کی شخصیت میں دوسری مرتبہ دہرایا۔

---

قائداعظم محمد علی جناح کے سایۂ عاطفت میں جب مسلم لیگ جوان ہوئی اس وقت قائداعظم کے لئے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ اردو زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے مسلم عوام کے قلوب تک پہنچنے نہ پائے تھے۔ قائداعظم کو اس وقت ایک لسان الامت کی ضرورت تھی ایسی زبان کی جس کی شوخیٔ گفتار اور سحر نطق سے مسلم عوام کے دلوں کی دھڑکن مسلم لیگ کی دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ ہو۔ قائداعظم کی پُرخلوص تمنا بارآور ہوئی۔ قائداعظم کو بہادر خاں مل گئے اور مسلم لیگ کو زبان مل گئی۔

قائد ملت کی شوخیٔ گفتار اور نواہائے جگر گداز سے آج کس ہندی مسلمان کے کان لذت گر نہیں ہیں —— ؟ کون ہے جو قائد ملت کے لب اعجاز کی سحر بیانی سے مسحور نہیں ہے —— ؟ کون نہیں جانتا کہ قائد ملت نے اپنے شعلہ آواز سے مسلمان فرقوں کے آپس کے جھگڑوں، تفرقوں اور تعصبوں کو جلا کر بھسم کر ڈالا لکھنؤ میں جب شیعہ اور سنی فسادات نے بنتی ہوئی مسلم لیگ کے دل میں ایک گہرا زخم لگایا تھا اس وقت قائد ملت کی ایک ہی تقریر نے اس زخم کو مندمل کر دیا۔ لاہور میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے موقع پر حکومت اور خاکساروں کی ہنگامہ آرائیوں نے مسلم عوام میں بے چینی اور انتشار پیدا کر دیا تھا۔ مجمع قابو سے باہر تھا قائداعظم

محمد علی جناح کی آواز کا جادو بھی کام نہیں کر رہا تھا۔ اس وقت قائداعظم نے اسٹیج پر کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ "اب بہادر خاں تقریر فرمائیں گے۔" یہ آواز کیا گونجی کہ بے چین و مضطرب مسلمانوں کا سیلاب دیکھتے ہی دیکھتے ہی ساکت ہو گیا بہادر خاں کے نام نے سارے مجمع پر ایک سناٹا طاری کر دیا۔ اور پھر جب بہادر خاں کے نطق معجز اثر نے طلسم خموشی توڑا تو بقول میاں بشیر احمد ایڈیٹر ہمایوں سارا مجمع پتھر ہو کر رہ گیا۔ اس تقریر کے بعد قائداعظم محمد علی جناح نے بڑی مسرت اور فخر سے کہا

"بہادر یار جنگ کے بعد کسی اور کا بولنا غلطی ہے"

علی گڑھ میں حضرت قائد ملت کی سب سے پہلی تقریر ۱۹۴۱ء میں ہوئی تھی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اسٹیج مقرر کی امتحان گاہ ہے چنانچہ جب قائد ملت اسٹیج پر تشریف لائے تو پرشور آوازوں اور تالیوں سے قائد ملت کا "امتحان" لیا جانے لگا۔ لیکن قائد ملت نے مسکراتے ہوئے تقریر کا آغاز اس جملے سے کیا

"جانتا ہوں کہ یہ اسٹیج کی ہال ہے اور یہاں مقرر کا امتحان لیا جاتا ہے مگر میں ایک مرد مومن ہو کر بے امتحان کی زندگی کو موت سمجھ کر آپ لوگوں کے سامنے کھڑا ہوا ہوں......

یہ ایک ہی جملہ پرشور آوازوں پر گویا بجلی بن کر گرا۔ اور کسی میں اتنا ہوش نہیں تھا کہ اپنی زبان کھولے ——— سچ ہے جب بہادر خاں اپنی زبان کھولتا تھا تو پھر ساری دنیا گونگی ہو جاتی تھی ——— اس کے بعد قائد ملت نے رات کے تین بجے تک تقریر کی ——— تھک گئے مگر نمازیان علی گڑھ چیخ رہے تھے "ہماری حس سامعہ ابھی پیاسی ہے ——— نواب صاحب ——— تقریر کیجئے

ہم ابد تک ایسی سحر طراز زبان سننے کے لئے تیار ہیں۔"

قائد ملت مرحوم نے ایک بار خود ہی اپنی معجز بیانی کی مدح فرمائی ہے اس بارے میں تفصیل آپ کو اسی کتاب میں آگے ملے گی۔ میں یہاں وہ قطعہ نقل کئے دیتا ہوں جو قائد ملت نے اپنے سحر خطابت پر لکھا تھا۔

آگاہ رموزِ دینِ فطرت ہوں میں
کچھ مجھ سے سنو لسانِ امت ہوں میں
ہیں خطبہ سرا نہیں تو سونی ہے بزم
شاہنشۂ اقلیم خطابت ہوں میں

اس قطعہ کی صداقت کا لطف ہر اس شخص سے پوچھئے جس نے قائد ملت کی تقریر جگر گداز اپنے کانوں سے سنی ہے۔ قائد ملت نے اپنی زبان کے حربے سے ایسے ایسے سنگین معرکے سر کئے ہیں جن کے مفصل تذکرے آپ اس کتاب میں پڑھیں گے۔ کبھی انہوں نے بے چین و مضطرب اجتماعوں کو اپنی سحر بیانی سے ساکت وصامت کر دیا تو کہیں فرقہ واری تعصبات کو نوکِ زبان سے فنا کر دیا۔ یہ سب بہادر خاں کی زبان ہی کا اعجاز تھا کہ مسلم لیگ کی دس لاکھ روپئے کی اپیل کی خاطر الہ آباد کے سالانہ جلسے میں قائد ملت نے ایک رقت آمیز تقریر فرمائی اور ایک چبھتا ہوا جملہ کہدیا — "جو مال کا ایثار نہیں کر سکتے وہ جان کیا دے سکیں گے۔" یہ سننا ہی تھا کہ قائد ملت پر روپیوں اور زیورات کی بارش ہونے لگی۔ اور اس طرح قائد ملت کے ہونٹوں کی ایک جنبش نے چند لمحات کے اندر سوا لاکھ روپیئے جمع کر لیا تھا۔ سب سے بڑی حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ قائد ملت اس زمانے میں پیدا ہوئے جو ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کا زمانہ کہلاتا ہے جب کہ گفتار پر تعزیریں ہیں اور زبان بند زبان ہو گئی ہے۔

قائدِ ملت کی زبان میں یہ اعجاز کہاں سے آیا ــــــ؟ اس کا سبب جاننے کے لئے ہر شخص قیاس آرائیاں کرتا ہے۔ مگر یہ تو ایک واضح بات ہے۔ قائدِ ملت کی زبان دماغ کے بجائے دل سے جڑی ہوئی تھی۔ اس دل سے جو سارے مظلوم اسلامیانِ ہند کے درد اور سوز سے بھرا ہوا تھا قائدِ ملت کا ایک ایک لفظ دماغ کے بجائے دردمند دل سے نکلتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ دل کی نکلی دلوں پر ہی اثر کرتی تھی۔

قائدِ ملت کی عمر کے آخری دو چار برسوں میں نزلے اور جوشِ گفتار کے باعث آواز میں خرابی پیدا ہوگئی تھی۔ ڈاکٹروں اور اطباء نے مشورہ دیا کہ غدود کا اپریشن کرایا جائے۔ تو قائدِ ملت نے جواب دیا۔

"آواز میرا ایک بڑا حربہ ہے اور اس سے مسلمانوں کی
کافی خدمت ہوتی ہے اس لئے اس کو خراب کرنا گوارا نہیں"

یہ تھا وہ مسلمانی ایثار ــــــ مسلمانوں کی خدمت کے لئے بہادر خاں نے اپنی جاگیر و اعزاز کے علاوہ اپنے جسم اور روح تک کو وقف کر رکھا تھا

یہ کتاب اسی مردِ مومن کی سوانح ہے جسے لوگ نواب کہتے تھے مگر وہ نواب نہیں تھا۔ اس نے جاگیر و خطاب کے بدلے وہ فقرِ شبیری قبول کیا جو میراثِ مسلمانی ہے مسلمان اسے اپنا قائد سمجھتے تھے مگر اس نے اپنے آپ کو ہمیشہ خادمِ اسلام سمجھا۔ اپنی زندگی بھر وہ امتِ اسلامیہ کے لئے روتا رہا۔ اور آج ساری امتِ اسلامیہ اس کے لئے رو رہی ہے۔

اب صبا سے کون پوچھے گا سکوتِ گل کا راز
کون سمجھے گا چمن میں نالۂ بلبل کا راز

---

# پیش لفظ

## از حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی مُدظلہ

دیباچہ، تعارف، پیش لفظ کی فرمائشیں کچھ نئی نہیں، آئے دن ہوتی ہی رہتی اور تعمیل بھی کبھی طوعاً کبھی کرہاً، کبھی "بادل خواستہ" کبھی بادل ناخواستہ کرنی ہی پڑتی ہے۔ حیات قائد ملت کے پیش لفظ کی جب فرمائش ہوئی تو دل نے اپنے اندر کوئی امنگ اور شوق محسوس نہ کیا، بلکہ خیال یہ گزرا کہ یہ بھی انہیں رسمی فرمائشوں کی قسم کی کوئی چیز ہوگی، مگر خیر نام تو بہادر مسلمان کا درمیان آگیا ہے اس لیے لکھ دینا تو کچھ نہ کچھ بہر حال ہے ــــــ مسودہ آیا، اور اس خیال کے ماتحت فرصت کے انتظار میں کئی دن یوں ہی پڑا رہا۔ آج کھولا تو اپنی آنکھیں بھی کھلیں، بدگمانی دور اور گرانیٔ طبع کافور ہوئی۔ خیال کو اپنی غلطی محسوس ہوئی۔ شوق ونشاط کی مدد سے کتاب ایک ہی نشست میں کہنا چاہیے کہ شروع سے آخر تک پڑھ لی گئی۔

زندہ کی تصویر کھینچیے تو زندگی کا رنگ اس میں جھلکتا نظر آئے گا، زندہ کا ذکر کیجیے تو دل کی دھڑکن اور سانس کی گرمی محسوس ہوئے بغیر نہ رہیگی بہادر یار جنگ کا افسانۂ حیات بیان ہو رہا ہو تو کیسے ممکن ہے کہ اس شخصیت کی جاذبیت اور دلکشی اپنا عکس کاغذ کے صفحات پر نہ ڈال دے۔

ع جان ڈالی ہے ترے ذکر نے افسانہ میں

لیکن یہ تنہا موضوع لطیف کی لطافت کی برکت نہیں، بڑا دخل اس میں فسانہ گو کے سلیقہ، اِخلاص، حسن اَدب اور ہوشمندی کو بھی ہے۔

مصنف سے ذاتی طور پر میں بالکل واقف نہیں۔ غالباً نوعمر اور نومشق ہیں۔ لیکن کتاب کو دیکھیے تو نومشقی کی خامیوں سے یکسر خالی، پختہ کاری کے نقش ونگار سے آراستہ ——— بڑے لوگوں کی زندگی برق کی تجلی ہوتی ہے، کون کیمرا اس تیز چمک کو محفوظ رکھ سکتا ہے؟ دریا کی ایک لہر ہوتی ہوتی ہے، آئی اور گزر گئی، کس کا ہاتھ اُسے پکڑ سکا ہے؟ مبارک ہے وہ قلم جو نقاشِ قدرت کے اِن نقوش کو کسی معقول حد تک تحریر کے قیود و حدود کے اندر لا سکے۔ گل کی شادابی نہ سہی، رنگینی نہ سہی، نازکی نہ سہی، تازگی نہ سہی، اس کی خوشبو تو عرقِ گلاب میں کھینچ کر لا سکے!

محمدؐ بہادر خاں قدس اللہ سرہٗ کیا تھے اور مسلم لیگ میں اِس قدر سرگرم عمل کیوں تھے؟ یہ عطر کشید کیا ہوا خود انھیں کے قلم سے ملاحظہ ہو:-

---

"میری منزل مسلمان کو منفرداً اور جماعت اسلامیہ کو مجتمعاً منہاجِ نبوت پر دیکھنا ہے۔ میرا عمل، میری مجلس کی قرار دادیں اور میری تقاریر اس اجمال کی تفصیل ہیں ...."

یں مسلم لیگ کے ساتھ اس لیے ہوں کہ غیر شعوری طور پر اس کا
قائد اسی منزل کی طرف جا رہا ہے اسی مقصد کو مقصد حیات
سمجھنے والوں کا ایک بڑا گروہ لیگ یں پیدا ہو گیا ہے اور
آپ حیران ہوں گے کہ یہ سب کے سب دیوانے داڑھی
منڈھے اور اصطلاحاً غیر عالم ہیں۔"

مرحوم بڑے فریس، بڑے ذکی، بڑے مردم شناس بھی تھے۔ سلطان ابن سعود کی حکومت، امیر امان اللہ خاں غازی، نادر شاہ، قسطنطنیہ، انگورہ وغیرہ سے متعلق ان کے جو مختصر تاثرات اس حیات یں قلمبند ملیں گے، وہ ان کی حکیمانہ نظر پر گواہِ ناطق اور ان کی فراست ایمانی پر شاہد صادق ہیں۔

مرحوم سے مجھے محبت اور شیفتگی تھی اور دل یں عظمت ہی نہیں۔ عقیدت بھی تھی۔ اس پر بھی بعض قابل رشک باتیں اس کتاب سے پہلی بار میرے علم یں آئیں، مثلاً یہ کہ مرحوم کی براہِ راست دعوت و تبلیغ سے غیر مسلم (۵) ہزار کی تعداد میں مسلم بن چکے تھے! اور جن پر بالواسطہ ان کی دعوت و تبلیغ سے راہ حق کھل گئی تھی، ان کا شمار تو (۲۰) ہزار تک پہنچتا ہے! اللہ اللہ! ذالك فضل الله يوتيه من يشاء مرحوم کا کوئی ایک بھی دوسرا عمل صالح نہ ہوتا، تنہائی یہی ایک عمل ان کے مرتبہ کو کس بلند سے بلند مقام تک کے پہنچانے کے لیے کافی نہیں!

مرحوم کی حیات نو اور مقبولیت کے سلسلہ یں جو خواب آمجد حیدرآبادی کی زبان سے نقل ہوا ہے وہ بھی نہایت موثر ہے۔ حبیبؐ خدا کی زبان سے "ہمارے حبیب" کا خطاب مجد و شرف کی انتہا ہے! — کوئی کن کن باتوں پر رشک کرے، اور کہاں تک کرے!

اِسلامی ہند کو دُو سب سے بڑی نعمتیں دو انسانوں کے قالب میں اِس بیسویں صدی عیسوی میں عطا ہوئی تھیں۔ ایک محمد علیؒ دوسرے بہادر خاںؒ امت کے دن پھرنے کی اگر کچھ توقعات تھیں، تو انھیں دو کی ذات سے۔ محمد علیؒ ابھی بوڑھے بھی نہیں ہوئے تھے کہ واپس بلالئے گئے، اور ان کے حقیقی جانشین، بلکہ نقش ثانی، بہادر خاں تو ابھی ان سے بھی کہیں کم سن تھے! حکیم مطلق کی مصلحتیں کس بندہ کی سمجھ میں آسکتی ہیں؟ غیروں کی، منکروں کی، دشمنوں کی، باغیوں کی، مسلسل اقبالمندی، اور اپنے ہی محبوب کی امت کی یہ صبر آزما آزمائشیں! سچ کہا جس عارف نے بہتے ہوئے آنسوؤں اور ٹوٹے ہوئے دل و جگر کے ساتھ کہا ہے کہ:-

ما پروریم دشمن و ما می کشیم دُوست
کس را رسد نہ چون و چرا در قضائے ما!

عبدالماجد

دریاباد، بارہ بنکی

۱۱۔ اکتوبر ۱۹۲۵ء

حکیم امت علامہ اقبال ؒ نے بتایا تھا، اور تمنا کی تھی :-

ایں نکتہ کشائندۂ اسرار نہانست
ملکست تن خاکی و دیں روح روانست
تن زندہ و جاں زندہ ز ربطِ تن و جانست
با سبحہ و سجادہ و شمشیر و سناں خیز
از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز!

اقبال کی یہ آرزو کہاں پوری ہوئی ؟ کون دیدہ ور اٹھا جس نے ملک کے خاکی جسم میں دین کی حیات پرور روح پھونکنی ناگزیر سمجھی ؟ کس کے پاس "سبحہ و سجادہ" اور "شمشیر و سناں" یکساں اہمیت رکھتے تھے ؟ ملکوتی تخیل اور بلند جذبہ کا صحیح امتزاج کہاں دکھائی دیتا تھا ؟ کس کی نگہ بلند تھی، سخن دلنواز تھا اور جان پرسوز تھی ؟ کس کا فقر نہ کبھی محتاج سلطان رہا نہ کسی وقت مرعوب سلطان ہوا ؟ مسلمانوں کی مسلسل غلامی اور مردنی میں کس نے احساس زیاں پیدا کر کے لہو گرمانے کی صحیح ترین کوشش کی ؟ "اشداء علی الکفار رحماء بینھم" کے جلال و جمال کا اعلیٰ امتزاج آج کی گئی گزری حالت میں بھی کس ہستی میں نمایاں تھا ؟ اور سچ پوچھئے تو کس کی زندگی خود ایک زندہ کرامات تھی ؟—— ہندوستانی مسلمانوں کی منظم جد وجہد

کی تاریخ میں ایک مولانا محمد علی ؒ کو چھوڑتے ہوئے سوائے محمدؒ بہادر خاں ؒ کے اور کس کا نام لیا جا سکتا ہے؟ بلکہ حقیقت تو یہی ہے کہ صرف محمدؒ بہادر خاں (اعلیٰ اللہ مقامہ) ہی کی زندگی ایسی ہے جہاں ابتدا سے انتہا تک اس جامعیت اور صحیح اسلامی کردار کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے، جس کسی حقیقت شناس اور حق پسند شخصیت نے مرحوم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالی بس یہی کہتے سنا گیا۔

در بزم قدح نوشاں، در چشم بلا کوشاں
معشوق ترا دانم، جانانہ ترا یابم

---

ایسی جامع ہستی کی سوانح نگاری کا بیڑا اٹھانا، مجھ جیسے بے بساط کے لیے یقیناً ایک بیجا جسارت تھی، لیکن مرحوم کی محبت اور ڈھائی سالہ قرب جس میں "درس تفسیر" اور "درس اقبال" کی خذف کو نگیں بنا دینے والی صحبتیں خاص ہیں، اس جرأت کا محرک ہوا، پھر بھی شاید یہ احساس خیال کی سرحد سے نکل نہ سکتا لیکن احباب کے مسلسل اصرار نے اس کو عمل کے میدان میں لا کر ہی چھوڑا، مرحوم سے وابستگی کا اظہار اس سے زیادہ ممکن نہیں کہ جب تک وہ رہے نگاہ نے کسی اور کے نظارہ کو گوارا ہی نہ کیا، لیکن الحمد للہ کہ یہ چند اوراق لکھتے وقت اس کی پوری احتیاط برتی گئی کہ جذبات کا سیلاب عقل کی سرحد سے نہ گزر سکے اور عقل کی سرحد شریعت کے حصار سے بڑھنے نہ پائے۔ اکثر واقعات کی شہادت میں خود مرحوم ہی کے الفاظ لائے گئے ہیں، خاندانی تاریخ کی حد تک "لسان الامت" والے کتابچہ پر اعتماد کیا گیا جو مرحوم کی نظروں سے گزر چکا تھا، مرحوم کی

بعض اعلیٰ صفات کی تائید میں صاحب "معارف" اور صاحب "صدق" کی تحریروں کے جواہر پارے نقل کیے گئے ہیں۔ اِس احتیاط کے باوجود اگر کوئی فروگزاشت ہوئی ہو تو اللہ تعالیٰ راقم کو معاف فرمائے ——— اصل کتاب کے آخر میں ایک مختصر مضمون مرحوم کے مخدوم حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ کا بھی شریک ہے۔

چاہیئے تو یہ تھا کہ جس طرح علامہ شبلی کی سوانح، حضرت علامہ سید سلیمان ندوی کے قلم نے لکھی، رئیس الاحرار محمد علی کے احوال حضرت مولانا عبدالماجد کے قلم سے نکلے، اِس خدا ترس، عاشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) مجاہد اسلام قائد ملت کی زندگی کا نقشہ بھی کسی ایسی ہی جامع ہستی کے ہاتھوں کھینچا جاتا، لیکن ڈیڑھ سال کی طویل مدت گزر جانے کے باوجود ہر گویا کو خاموش اور ہر رقم طراز کو ساکت دیکھکر اگر کوئی خاموش زبان کہہ اٹھے اور نہ لکھ سکنے والا بھی خامہ فرسائی کی جرءت کر جائے تو تعجب نہ ہونا چاہیئے!

حالات زندگی لکھتے وقت اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے کہ موقع بہ موقع صحیح اسلامی پہلو کی وضاحت ہو جائے تاکہ "سوانح" محض واقعات کا ایک مجموعہ بن کر نہ رہ جائے بلکہ تھوڑا بہت اسلامی معلومات میں بھی اضافہ ہو سکے ——— بہر حال

سرِ خاکِ شہیدے برگ ہائے لالہ می پاشم
کہ خونش با نہالِ ملت ما سازگار آمد

دلریش

غلام محمدؐ

# اپنی حقیقت اپنے قلم سے

یہ حقائق نامہ مرحوم نے اپنے دوست مولانا محمد علی استاد شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ کے نام، لیگ کے سالانہ جلسۂ کراچی سے واپسی پر تحریر فرمایا تھا، اس کا ابتدائی حصہ اخبار رہبر دکن میں کچھ عرصہ قبل شائع بھی ہو چکا ہے، یہاں پورا خط نقل کیا گیا ہے۔ ۲۴ ربیع الثانی ۶۳ھ

صدیق مکرم زادت الطافکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

ابھی غسل خانہ سے سفر کی تکان دور کر کے نکلا تھا کہ آپ کا اخلاص نامہ ملا، شروع سے آخر تک اس کو نہایت غور سے پڑھا، گو آپ نے خود ہی آخر میں اس ارادہ کا اظہار فرمایا ہے کہ کسی دن زحمت فرمائیں گے، لیکن اس وقت ایک مختصر جواب پیش کر رہا ہوں۔

آپ کے ارشادات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے میرا سطحی نہیں بہت

گہری نظر سے مطالعہ فرمایا ہے۔ آپ کے خط کے جواب تین طرح کے ہو سکتے ہیں۔ بہت مختصر اور ایک جملہ میں یہ کہ آپ کا اندازہ بالکل صحیح ہے، میں اسی طرف جا رہا ہوں یا لیجا رہا ہوں جس طرف آپ کی توجہ ہے۔ دوسرا بہت تفصیلی جس کے لیے ملاقات ہی صحیح طریقہ ہو سکتا ہے۔ لیکن تیسرا بالاجمال تاکہ یہ اجمال تفصیل کی اساس بن سکے۔

پہلے اجازت دیجیے کہ خود اپنا بے لاگ جائزہ لوں جس میں نہ اِنکسار ہو نہ تعلیٔ شاعرانہ۔ میری قابلیت علمی چاہے علوم دینیہ والسنۂ مشرقیہ سے متعلق ہو، چاہے علوم حدیثہ، مغربیہ کی نسبت، بہت سطحی اور صرف بقدر ضرورت ہے، انکساراً نہیں حقیقتاً گنہگار ہوں اور اس روحانی طاقت اور تقوے کی قوت سے بے بہرہ جو ایسے عزائم رکھنے والے کے لیے درکار ہے۔ لیکن قوم کی اجتماعی فکر کو سمجھنے اور اس سے کام لینے کی بے پناہ صلاحیت قدرت نے مجھے عطا فرمائی ہے۔ اور صرف یہی صلاحیت میری اس وقت تک کی کامیابی کا اصلی راز ہے۔ مجھے ہر وقت اپنی بے راہ روی کا اندیشہ رہتا ہے۔ ڈرتا ہوں، دعائیں کرتا ہوں اور امرھم شوریٰ بینھم کو اپنا دنیوی سہارا سمجھتا ہوں۔ میرے بنیادی معتقدات میں سے یہ ہے کہ جس جماعت سے توصیۂ حق کی عادت جاتی رہتی ہے وہ کبھی خُسران سے بچکر منزل فلاح تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس لیے خلوص نیت کے ساتھ جو وصیت و نصیحت کی جائے اس کو خُدا کی رحمت اور نصیحت کرنیوالے کی سب سے بڑی عنایت سمجھتا ہوں۔ آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے آج کے مکتوب میں اس کی طرف توجہ فرمائی، اب سنیئے میری منزل کیا ہے؟

# میری منزل مسلمان کو منفرداً اور جماعت اسلامیہ کو مجتمعاً منہاج نبوت پر دیکھنا ہے

یہ اعمال، میری مجلس کی قرار دادیں اور میری تقاریر اس اجمال کی تفصیل ہیں۔ گو ہمت عالی کے نزدیک یہ منزل بھی ایک سنگ میل ہے اور حقیقی منزل تاج خلافت الہیہ کا زیب سر کرنا اور فرشتوں کو اپنے سامنے سجدہ ریز دیکھنا ہو سکتا ہے، لیکن میں ان سب کو اپنے نصب العین کے لازمی نتائج تصوّر کرتا ہوں، جس طرح آگ سے لازماً گرمی ملتی ہے، اسی طرح طریق مصطفوی کا سالک بے کھٹکے انتم الاعلون کا مخاطب ہو جاتا ہے، امت وسط بنجاتا ہے، خیر امت ہو جاتا ہے اور انا جعلنا کم خلائف فی الارض کا مصداق قرار پاتا ہے۔

مسلم لیگ کے ساتھ اسی لیے ہوں کہ غیر شعوری طور پر اس کا قافلہ اسی منزل کی طرف جا رہا ہے۔ پاکستان کے دستور حکومت کی تحریک اس سال کے اجلاس میں نہ آسکی اور مجلس موضوعات نے اس کو قبل از وقت اور خلاف مصلحت قرار دیا، لیکن یہ دیکھکر خوشی ہوئی کہ اس مقصد کو مقصد حیات سمجھنے والوں کا ایک خاصہ بڑا گروہ لیگ میں پیدا ہو گیا ہے، اور آپ حیران ہونگے کہ یہ سب کے سب دیوانے داڑھی منڈے اور اصطلاحاً 'غیر عالم' ہیں۔ انکی مایوسی سے دل کو رنج ہوا۔ آخری اجلاس کی آخری تقریر میری یادہ گوئیاں تھیں اس میں اِس موضوع پر تفصیلی بحث رہی اور لیگ کے پلیٹ فارم سے اللہ نے میری زبان سے اعلان کروایا کہ پاکستان کا دستور الٰہی دستور اور وہاں کی

حکومت قرآنی حکومت ہوگی، اور سب سے بڑھکر قابل مسرت یہ کہ جب میں دوران تقریر اس مقام پر پہنچا تو قاید اعظم نے زور سے اور بڑے جوش سے میز پر مکا مار کر فرمایا You are quite Right. یعنی تم بالکل درست کہتے ہو، اور میں نے فوراً اعلان کر دیا کہ قاید اعظم سے میرے قول پر سند تصدیق مل گئی۔

راہ کی مشکلات کا کچھ نہ پوچھئے، قاید اعظم کی راہ میں انگریز ہے، ہندو ہیں اور خود ان کی جماعت کے منافقین ہیں اور میرے راستہ میں ان سب سے بڑھکر ایک اور طاقت ہے جس کو نہ توڑ سکتا ہوں نہ جس کے رہتے اپنی منزل کی طرف بڑھ سکتا ہوں، اپنی فکر کی واماندگیوں کا حال ممکن نہیں کہ زبان قلم سے ظاہر کر سکوں۔

کسی دن ضرور ملیئے تاکہ دل کی بھڑاس نکلے، لیکن وقت کا تعین بذریعہ ٹیلیفون کر لیجئے تاکہ میں بھی فرصت نکال سکوں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ آپ میرے لیے دعا کیجیے، مجھے آپ کی دعا کے مقبول ہونے کا اِس لیے یقین ہے کہ اس میں اخلاص ہوگا اور وہ ہر غرض بیجا اور تقاضائے نفس سے پاک ہوگی۔

اللھم افرغ علینا صبرا و ثبت اقدمنا و انصرنا علی القوم الکافرین ۔

احقر العباد

محمد بہادر خاں غفرلہٗ

# صبحِ زندگی

**نسب**

محمد بہادر خاں (اعلی اللہ مقامہٗ) قدیم افغانی قبیلہ کے سدوزئی پٹھان تھے، جنھیں عرف عام میں بنّی پٹھان کہا جاتا ہے، ان کے اَجداد نے احمد شاہ ابدالی کے زمانہ میں، جب ہر شمشیر زن قسمت آزماتا تھا، کچھ حوصلہ مند سپاہیوں کی جمعیت کے ساتھ ہندوستان کا رخ کیا۔ آپ کے جد اعلیٰ محمد دولت خاں اول نے قصبۂ بوراباسٹ ریاست جے پور میں طرح اقامت ڈالی، اور راجہ سے کچھ جاگیر پائی۔ ان کے تین لڑکے محمد نصیب خاں، محمد ماندور خاں اور محمد بہادر خاں اول تھے — ۱۲۳۵ھ میں اس خاندان نے جنوب کی طرف کوچ کیا، اور حیدرآباد اس وقت آئے جب مملکت آصفیہ کی باگ ڈور نواب سکندر جاہ بہادر کے ہاتھوں میں تھی۔

محمد دولت خاں اول جب دکن وارد ہوئے تو یہاں ہر طرف خلفشار اور بدامنی پھیلی ہوئی تھی، ایک طرف مرہٹہ قوم کی یورشیں تھیں، دوسری طرف

لیٹروں، بدمعاشوں اور ٹھگوں نے عوام کی زندگی کو پرخطر کر رکھا تھا۔ محمد دولت خاں اولیٰ ایک راسخ العقیدہ مسلمان اور دلیر سپاہی تھے، اپنے سپاہیانہ اوصاف کی بنا پر دربار شاہی میں رسائی پائی۔ نواب سکندر جاہ کی نگاہوں نے ان کی صلاحیتوں کو تاڑلیا اور فتنہ و فساد کا قلع قمع ان کے ذمہ قرار پایا۔ محمد دولت خاں اولیٰ اور ان کے بڑے فرزند محمد نصیب خاں اولیٰ نے بڑی فراست اور تدبر کا ثبوت دیا۔ بہت جلد بدامنی رفع ہوگئی اور مخالف عناصر اس طرح آپس میں بل گئے گویا کوئی مخالف تھی ہی نہیں۔ اس وقت سے ان کا شمار ریاست کے وفاداروں اور بہی خواہوں میں ہونے لگا، اور ان پر بخشش کے دروازے کھل گئے۔ صوبہ برار میں تقریباً ۴ لاکھ کی جاگیر عطا ہوئی، دو ہزار سوار، نوبت، برق انداز، ہاتھی، پالکی، ڈنکہ وغیرہ جو اس زمانے کے اعلیٰ اعزاز تھے، عطا کئے گئے۔ ہفت ہزاری منصب بھی عطا ہوئی اور آئندہ مزید فوجی اختیارات سپرد کرنے کا وعدہ کیا گیا۔

ان کے بعد محمد نصیب خاں اولیٰ نے بھی اپنا آبائی وقار اسیطرح قائم رکھا، چنانچہ مبارز الدولہ اور ناصر الدولہ کے قضیہ کو ختم کرنے میں اسی خاندان کا ہاتھ رہا۔ اور اسی بنا پر محمد نصیب خاں اولیٰ نے خود نواب ناصر الدولہ کے ہاتھوں خلعت پائی، نواب کے لقب، خانی، بہادری، اور عماری و نوبت وغیرہ کے اعزاز سے معزز ہوئے اور اکٹ پلی، لال گڑھی وغیرہ مواضعات بطور جاگیر پائے، نیز ایک ہزار سوار اور دو ہزار روپیہ کی منصب جلیل بھی عطا ہوئی۔

نواب محمد نصیب خاں (نصیب یاور جنگ اولیٰ) نے اپنے اکلوتے بھتیجے محمد دولت خاں ثانی کو چھوڑ کر ۲۹ ربیع الثانی ۱۲۷۱ھ کو انتقال کیا۔

محمد دولت خاں نصیب یاور جنگ ثانی قرار پائے۔ اُن کے جانشین ان کے فرزند محمد نصیب خاں، نصیب یاور جنگ ثالث ہوئے، جن کے تین فرزند محمد بہادر خاں (نواب بہادر یار جنگ مرحوم) نواب محمد مانڈور خاں، اور نواب محمد دولت خاں ہیں ——— اِس طرح یہ پورا خاندان، جیسا کہ خود مرحوم فرمایا کرتے تھے، صرف چار ناموں پر مشتمل تھا:- (۱) محمد دولت خاں (۲) محمد نصیب خاں (۳) محمد مانڈور خاں (۴) محمد بہادر خاں۔

بہ ہرحال پورا خاندان سرفروش اور شمشیر زن اور ہر ایک فرد سے وفا شعاری، خود داری اور حمیّت کے سپاہیانہ اَوصاف نمایاں ——— لیکن آخر اس شجرہ سے واقفیت کا منشاء؟ کیا یہ مقصد ہے کہ خاندان کی ناموری اور دلیری بتا کر محمد بہادر خاں (نوراللہ مرقدہٗ) کے لیے سامان فخر فراہم کیا جائے؟ یہ تو ایک باغیرت بہادر مسلمان بلکہ ایک عام عقلمند اِنسان کے لیے بھی باعث ننگ ہے، کیونکہ

برنسب نازاں شدن نادانی است
حکم او اندر تن و تن فانی است ——— (اقبال رح)

اور اسلام نے کب اسے روا رکھا ہے؟ پھر اِس اجداد شماری سے حاصل؟ صرف یہی اور اتنا ہی کہ شرافت نسل اور نسلی صفات، جن کے اثرات، عقل پرستوں اور خدا پرستوں کے ہاں یکساں مسلّم ہیں، ظاہر ہو جائیں ——— کیا ہر نبیؑ کا ایک نجیب خاندان میں مبعوث ہونا، واقعہ نہیں ہے؟ دوسری طرف کیا آج کے ماہرین فلسفہ و نفسیات کو اس سے انکار کی مجال ہے کہ آبائی صفات اولاد میں منتقل ہوتے ہیں؟ ——— مشہور مفکر موسیولیبان نے اِنسانی زندگی کے دو ہی سب سے اہم موثرات بتائے ہیں!- (۱) گذشتہ

سلسلۂ خاندانی کا اثر (۲) ماں باپ کا اثر ——— آگے معلوم ہوگا کہ محمد بہادرخاں کی ذات کس طرح سپاہیانہ اوصاف کی اعلیٰ ترین جلوہ گاہ بنتی ہے۔

**ماحول اور اولاد** حیدرآبادی جاگیردار، جن کے اجداد کی عزت ان کے معرکوں کی جیت تھی، اب ان کی عظمت کا اظہار نوبت ونقارہ، خدمتگاروں کے غول اور خوشامدی مصاجبین کے حلقہ سے ہورہا ہے۔ جن کے شاہیں صفت اجداد کو میدان جنگ کی ہوائیں پسند تھیں، انھیں کی کرگس صفت اولاد اب پرفضا محلوں کے قفس کی عادی ہوچلی ہے، وہاں تلوار کی کاٹ تھی، یہاں پتنگ کی کاٹ ہے، ان کے ہاتھ تیر چھوڑتے تھے، ان کے ہاتھوں کبوتر چھوٹ رہے ہیں، وہاں تلوار کی صیقل کرنے اور تیر کی انی تیز کرنے سے فرصت نہ تھی، یہاں رقص وسرود سے مہلت نہیں آخر پھر ایک بار اس بتائے ہوئے اصول کی تصدیق ہوئی۔

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر وسناں اول طاؤس ورباب آخر

نتیجہ یہ ہوا کہ جن جانباز سپاہیوں کے نام سے اغیار کے رونگٹے کھڑے ہوتے تھے، ان کی "پدرم سلطان بود" کہنے والی اولاد کی اکڑ سے کسی کے جوں بھی نہیں رینگتی۔

نصیب یاورجنگ ثالث بھی ایک جاگیردار تھے، یہاں بھی وہی نوبت ونقارہ، وہی دنیائے دوں کی دلفریبیاں ——— مذہب کی یہاں بھی وہی رسمی حیثیت، ہندوانہ رسومات اسیطرح سرایت کئے ہوئے۔ شعبان کا مہینہ کیا آتا، نصیب یاورجنگ کے ہاں "ہولی" آتی، سینکڑوں روپیہ آتشبازی میں راکھ کیا جاتا، روشنی ہوتی، آگ سلگائی جاتی، اس کے گرد

طراف ہوتا، توہمات اور فضولیات پر یہ خرچ کسی خاص مہینے یا دن کے لیے مخصوص تھوڑا ہی تھا، لیکن خاص خاص دنوں میں رنگ رلیاں انتہا کو پہنچتیں ـــــــ یہ کوئی مبالغہ نہیں خود مرحوم کی زبانی سنی ہوئی کہانی ہے۔

لیکن قدرت کو پھر ایک بار ظلمت میں سے نور کی جھلک دکھانی منظور تھی، پھر ثابت کرنا تھا کہ مردہ زمین سے حیات پرور پودا اگانا اس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں یخرج الحی من المیت، کی عملی تفسیر پھر منکرین قدرت کو بتائی جانے والی تھی، چنانچہ اسی آذری ماحول سے ایک خلیل ؑ صفت حیات پیدا ہوتی ہے، جس کے لیے آبائی لات و منات کو پارہ پارہ کرکے۔ ع

"یکے جوی ویکے بین ویکے باش"

کا درس مقدر کر دیا جاتا ہے ـــــــ بہرکیف اللہ تعالیٰ یہ مطیع بندہ، جسے ماں باپ نے محمد بہادر خاں کہہ کے پکارا، ۲۷ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ م ۳ فروری ۱۹۰۵ء بمقام حیدرآباد ظہور پذیر ہوا۔

اعلیٰ ہستیاں ماحول کی پیداوار نہیں ہوتیں، بلکہ وہ اپنا آپ ماحول پیدا کرلیتی ہیں، تاریخ عالم میں اعلیٰ شخصیتیں ہمیشہ زمانہ کی راکب رہی ہیں، مرکب نہیں !، برے ماحول کی پیداوار خراب نسل ہی ہو سکتی ہے کیونکہ اصول فطرت ہے۔ ع

"گندم از گندم بروید جو ز جو"

مصلحین، ماحول شکن اور ماحول گر ہوتے ہیں! تقلید ان کا شعار نہیں بلکہ تجدید ان کا کام ہوتا ہے۔

تعلیم و تربیت :- مرحوم محمد بہادر خاں کی ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ دار

مفید الانام میں ہوئی، پھر مدرسۂ دار العلوم بلدہ میں بھی شریک رہے، دوران تعلیم مرحوم کی حیثیت ایک اوسط طالب علم سے زیادہ کی نہ تھی، اس عرصہ میں ان کی کوئی ادا اِس بات کا پتہ نہ دیتی تھی کہ آج کا یہ طالب علم کل کو ہندوستان کا ایک بڑا مدبر، اعلیٰ ترین خطیب اور بے مثل قاید ہوگا۔

ابھی میٹرک کے امتحان کی تکمیل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ بعض حالات کے تحت تعلیم کا سلسلہ ٹوٹ گیا، اور پھر کبھی مدرسہ میں داخلہ کی نوبت نہ آئی، لیکن مرحوم کو علم کا شغف بچپن ہی سے تھا، خانگی طور پر مولوی سعدۃ اللہ خاں صاحب اور مولوی سید اشرف شمسی صاحب (صاحبؒ تفسیر شمسیؒ) سے اِکتساب کا سلسلہ جاری رہا، خصوصاً علامۂ شمسی کی صحبت سے زیادہ مستفید ہوتے رہے، عربی ادب کے علاوہ تفسیر، حدیث اور فقہ کی باضابطہ تعلیم حاصل فرمائی ــــــ بس اِس کے بعد جو کچھ علم بڑھتا گیا اور جتنے مختلف علوم اور جتنی مختلف زبانوں پر قدرت حاصل ہوئی وہ سب مرحوم کی تنہا کوششوں کا نتیجہ اور خدائے تعالیٰ کے بے پناہ لطف و کرم کا ثمرہ تھا، خود مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ "میں نے فارسی کی ابتدائی کتابیں تک کسی سے سبقاً نہیں پڑھیں، صرف عربی ہی کی تعلیم ہوئی" ــــــ

جہاں تک تربیت کا تعلق ہے، اس کی سب سے بہتر درسگاہ ماں کی گود سمجھی جاتی ہے، سرسید کا مقولہ مشہور ہے کہ ماں کی گود، دوسو اساتذہ سے زیادہ موثر تربیت گاہ ہے ــــــ لیکن ابھی محمد بہادر خاں کو اس سرائے فانی میں آئے ہوئے ایک ہفتہ بھی نہ ہوا تھا کہ موت کے ہاتھوں نے ان سے ان کی والدہ کو چھین لیا، اور یہ اپنی نانی کے زیر تربیت آئے ــــــ مرحومہ ایک دین دار اور خدا ترس خاتون تھیں، قومی معاملات سے

بھی دلچسپی رکھتی تھیں، یہی وجہ تھی کہ اخبار بڑی پابندی سے پڑھا کرتی تھیں، تقریباً چودہ برس تک قاید ملت مرحوم انہی کے زیر تربیت رہے ——— نانی نے نواسہ پر مذہبی رنگ چڑھانے کی پوری پوری کوشش فرمائی اور کامیاب رہیں، بچپن ہی سے ادائی نماز اور تلاوت قرآن پاک کی بہت پابندی کرائی چنانچہ مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ جس روز صبح میں تلاوت نہ کرتا اس روز وہ مجھ سے قطع کلام فرماتیں، یہ کہتے ہوئے کہ "آج تم نے اللہ سے باتیں نہ کیں، میں تم سے بات نہ کروں گی" ——— مایوسی کا مقام تھا کہ والدہ کی اتنی جلد رحلت سے تربیت کا کیا سامان ہوگا؛ لیکن رب العالمین نے اس کا کیا اہتمام فرمایا! ذالك فضل الله يوتيه من يشا مرحوم جب مادری تربیت کی اہمیت کا ذکر فرماتے تو اپنے اس واقعہ کو ضرور بیان فرماتے اور اپنی نانی مرحومہ اور ان کی تربیت کا بہت ہی احسانمندی کے ساتھ تذکرہ فرماتے کہ :-

"جو کچھ مجھ میں ہے وہ اسی چودہ سالہ کمائی کا حاصل ہے"

درسی تعلیم سے ہٹ کر مرحوم کو فنون سپہ گری سے خاص اُنس تھا روح کی نشو نما کے ساتھ ساتھ جسم کی مضبوطی کا خیال بچپن ہی سے تھا، ایک مدت تک ورزش جسمانی جاری رہی، معقول معاوضہ پر بعض مستند استادوں سے تلوار اور لٹھ چلانے میں مہارت حاصل کی، نشانہ بازی اور پیرنے میں تو معدودے چند افراد مرحوم کی ٹکر کے ہوں گے، جدید فوجی اصول سے بھی پوری واقفیت حاصل تھی۔

**نوید اقبال مندی** ابھی مرحوم کی طالب علمی ہی کا زمانہ تھا کہ ایک ر

عجیب خواب دیکھا ـــــ مرحوم نے دیکھا کہ ایک قبر کھودی گئی ہے اور اس میں خود انھیں کفنا کر لٹایا گیا ہے، اور لوگوں کا ایک کثیر اژدحام ہے۔ صبح جب یہ خواب اپنے شفیق استاد علامہ شمسی سے ڈرتے جھجکتے بیان کیا تو علامہ نے فرمایا "پہلے مٹھائی لاؤ، پھر تعبیر سناتا ہوں"۔ مرحوم کو یک گونہ اطمینان ہوا کہ کوئی خراب بات تو نہیں، عرض کیا "مٹھائی ابھی حاضر کیے دیتا ہوں، تعبیر سنا دیجئے"۔ علامہ نے مسکراتے ہوئے فرمایا "آئندہ تمہیں مسلمانوں کی قیادت حاصل ہوگی"۔

وجود کیا ہے فقط جوہر خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود تیرا

**ماحول سے ٹکراؤ** اوپر ماحول کی تاریکی اور بے دینی کا ذکر ہو چکا، اس اندھیرے میں صرف مرحوم کی نانی کی ذات ایک چراغ تھی، لیکن وہ بھی چراغ سحر ـــــ لیکن چونکہ مرحومہ نے اپنے نواسہ کی مذہبی تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی ـــــ نہ معلوم ظاہری نگرانی کے علاوہ کتنی دعائیں کی ہوں گی ـــــ اور خود قدرت کو چونکہ ایک مذہبی رہنماء بنانا تھا، اس لیے بچپن ہی سے اسلامی حمیت اور پاس مذہب اور حفظ شریعت کا ذوق غالب رہا۔

عید کا موقع ہے، نصیب یاور جنگ اپنے محلہ کی مسجد میں نماز پڑھنے کا ارادہ رکھتے ہیں، بچوں کا ساتھ رہنا بھی ضروری ہے، محمد بہادر خاں ادھر والد کے اس عمل کے خلاف عیدگاہ کی ٹھانے ہوئے ہیں، والد کا اصرار ہوتا ہے کہ یہیں نماز پڑھی جائے، صاحب ہمت فرزند عیدگاہ کی اہمیت پر تقریر شروع کر دیتا ہے، والد منہ پھیر کر اپنی ہی بات پر مصر رہتے ہیں اور

محمد بہادر خاں عیدگاہ پہنچ جاتے ہیں۔

پندرہ، سولہ برس کی عمر ہو چکی، مسیں بھیگ رہی ہیں، سبزہ کا آغاز ہے، اتفاق کہ صرف ٹھوڑی ہی پر کچھ بال نکل آئے ہیں، باقی چہرہ صاف ہے ــــ مدرسہ جاتے ہیں تو ہم سبق ہنسی اڑاتے ہیں، کوئی "بکرا" کہہ کر پکارتا ہے تو دوسرا کسی اور نام سے چیختا ہے ــــ گھر آتے ہیں تو والد بزرگوار انتہائی مخالف، حکم پر حکم صادر ہو رہا ہے کہ فوراً ڈاڑھی منڈھوا دو، ادھر سے جتنی شدت ہے، ادھر سے اسیقدر استقامت اور استقلال کا مظاہرہ ہو رہا ہے ــــ والد ماجد نے جب دیکھا کہ ڈانٹ ڈپٹ سے کام نہیں چلتا تو ہم عمر دوسرے بھائیوں اور رشتہ داروں کو سکھا دیا کہ کبھی بہادر خاں کو پچھاڑ کر اس کی ڈاڑھی صاف کر دینا، ایک دفع جرأت کی گئی، ایک صاحب (رشتہ یاد نہیں) مرحوم کو غافل پاکر، ہاتھ میں قینچی لیے، سینے پر سوار ہو گئے مرحوم ویسے بھی قوی تھے اور اب تو ایک جذبہ کارفرما تھا، ان صاحب کو اس بری طرح دے پٹخا کہ پھر سے کسی نے اس قسم کا خیال بھی نہ کیا ــــ اس واقعہ کے بعد سے والد کی خفگی اور بڑھ گئی اور قطع کلام کر لیا گیا، لیکن یہ دُھن کا پکّا اپنے مقام سے ایک انچ نہ ہٹا، یہاں تک کہ اب گرداگرد داڑھی نکل آئی اور حسن دوبالا ہو گیا، (مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ) اب جو والد کی نظریں مجھ پر پڑتیں تو فوراً منہ پھیر لیتے، لیکن یہ روگردانی دوسرا ہی مفہوم رکھتی تھی، اب دوسروں سے فرماتے "کہ مجھے بہادر خاں کی صورت اتنی اچھی معلوم ہوتی ہے کہ ڈر ہوتا ہے، کہیں نظر نہ لگ جائے، اسلئے فوراً منہ پھیر لیتا ہوں"

یہ دو واقعات، جو بظاہر معمولی معلوم ہوتے ہیں لیکن جن کی حیثیت آئندہ زندگی کی تعمیر میں بنیاد سے کم نہیں، وہ ہیں جو احقر نے خود مرحوم کی

زبانی سنے، اور نہ معلوم اِس قسم کے کتنے مجاہدے کرنے پڑے ہوں گے، ماحول کی خباثت خود اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ قدم قدم پر رکاوٹیں پیش آئی ہوں گی، اور مجاہدۂ نفس کے بڑے بڑے اِمتحان دینے پڑے ہونگے ——— قدرت کو آفاق کی اصلاح کا کام لینا تھا، نفس کی اصلاح ضروری سمجھی گئی، آج کتنے دعویدارانِ اصلاح ہیں جنھوں نے اپنے نفوس کا تزکیہ اس طرح کر لیا ہے کیسی نادانی ہے کہ دوسروں کی بربادی پر تو دل پسیجے اور اپنی تباہی کی خبر ہی نہ ہو، ایک مریض دوسرے مریض کا کس طرح علاج کر سکتا ہے ——— بلکہ علاج تو دور کی چیز رہی، کوئی چھوٹے سے چھوٹا بھی ہمدردی کا ثبوت دے سکتا ہے۔ راز حیات تو یہی ہے کہ پہلے خود سنبھلے پھر دوسرے کو سنبھالے، پہلے اپنے اندر آتش عشق بھڑکا دے پھر ہزار انجمنوں کی گرمی کا باعث بنے۔

چوں خبر دارم زسازِ زندگی      با تو گویم چیست رازِ زندگی
غوطہ در خود صورت گوہر زدن      پس زخلوت گاہ خود سر بر زدن
زیر خاکستر شرار اندوختن      شعلہ گردیدن نظرہا سوختن (اقبال)

**والد کی رحلت اور ذمہ داریاں**

ابھی عمر کے ۱۸ برس بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ پدری شفقت سے بھی محروم ہونا پڑا، نواب نصیب یاور جنگ ثالث نے حرکت قلب کے یکایک رُک جانے سے اِس دنیا سے کوچ کیا، ——— ۱۸ برس کی عمر بھی کوئی عمر ہے، ایسی کم عمری میں والد کی رحلت ہی کیا کچھ بلا نہ تھی، پھر جاگیر اور اس کی ذمہ داریوں نے اور بھی پریشان کر دیا، فرزند اکبر کی حیثیت سے گھر اور جاگیر کے تمام امور کا بار یک بیک مرحوم کے کمزور کندھوں پر پڑا، اتنا ہی ستم نہ ہوا بلکہ ایک اور سبب سے بھی اس میں زیادہ الجھن پیدا ہو گئی، مرحوم نصیب یاور جنگ تقریباً ۵ لاکھ روپیہ کا قرض ترکے میں چھوڑ گئے

تھے، مرحوم قایدملت فرماتے تھے کہ "جونھیں والد کا اِنتقال ہوا، قرض دہندوں نے میرے دروازے کھٹکھٹانے شروع کئے، اور میں ان کے مطالبہ کو پورا نہ کر سکنے کی وجہ سے مارے شرم کے گڑا جاتا تھا۔"

قایدملت کو انتظامی قابلیت میں کمال حاصل تھا، پیچیدہ سے پیچیدہ معاملات کو اس خوبی سے سلجھا دیتے تھے کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی، اس صلاحیت کے ساتھ استقلال اور جوانمردی کی صفت ایسی تھی جس کی وجہ سے ہزاروں پریشانیوں میں گھر کر بھی پرسکون رہتے تھے ــــــ اِن صلاحیتوں کے باوجود تقریباً آٹھ سال کے بعد جاگیر کے جھگڑوں سے نجات مِل سکی، قرض ادا ہوچکا، جاگیر کے اندرونی انتظامات پہلے کی بہ نسبت بہت زیادہ سدھر گئے، رعایا میں سکون اور خوشی کی لہر دوڑ گئی اور قایدملت کی مقبولیت کا سکّہ بیٹھتا گیا، یہاں تک کہ جب اخیر عمر میں جاگیر واپس کر دی گئی تو جاگیر کے ہر مسلمان اور ہندو کو انتہائی قلق ہوا۔

لیکن توجہ طلب صرف جاگیر ہی کا امر نہ تھا، گھر کا ماحول بھی بہت بگڑ چکا تھا، غیر اسلامی رسوم اور کافرانہ رواج جڑ پکڑ چکے تھے، محمد بہادر خاں جب تک والد ماجد کے تحت تھے ان پر بجز اپنے نفس کے کوئی ذمہ داری نہ تھی، لیکن اب تو کل انتظام کی باگ ڈور انھیں کے ہاتھ میں ہے، یہ قطعاً ناقابل برداشت تھا کہ ان کی سرپرستی میں کوئی بدعت اپنا ظہور کرے، چنانچہ خود فرماتے تھے کہ "جیسے ہی والد کا انتقال ہوا اور انتظام میرے ذمہ ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ اب اس حدیث شریف کا اطلاق مجھ پر بھی ہو رہا ہے کہ "کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ" (تم سب کے سب راعی ہو اور تم سب سے اپنی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا) اسی لیے میں نے یک لخت تمام جاہلانہ رسومات روک دئے۔"

انفرادی اِصلاح کے بعد گھر ہی پہلی توجہ کا مستحق ہے، جس شخص سے یہ چھوٹا ماحول، جہاں اس کا حکم چلتا ہے، سنبھل نہ سکے وہ آفاق کی اصلاح کا بیڑا کیوں اٹھائے؟ یہی فریب ہے، یہی شیطان کی بعض رنگین اور دلفریب گھاتوں میں سے ایک گھات ہے، ورنہ کونسی عقل تسلیم کرسکتی ہے کہ جو گھر کی اصلاح میں عاجز رہ جائے وہ شہر کی اصلاح اور دنیا کی اصلاح میں کبھی بھی کامیاب ہوسکتا ہے، ——— اگر آج ہر ایک راعی (گھر کا بڑا) اپنی اپنی رعیت کی اِصلاح کرلے تو اِنقلاب کی کتنی منزلیں بلا انجمن بنائے، بغیر خالی خولی نعرے لگائے اور بغیر اغیار کی تقلید کئے، دم کی دم میں طے ہو جائیں، یہ خاموش اور مستحکم اِنقلاب اسی حدیث پر عمل کرنے سے پیدا ہوسکتا ہے۔

# مشاہدۂ آفاق

بادہ خوردن و ہشیار نشستن سہل است
گر بہ دولت برسی مست نگردی مردی

اُوپر بتایا جا چکا کہ محمد بہادر خاں کو اپنے والد سے ۵ لاکھ کا قرض ترکہ میں ملا تھا، اور باوجود انتہائی کوشش و کفایت شعاری کے، تقریباً ۸ سال اسکی ادائی میں صرف ہوئے ـــــــ اب جو نئے سال کی بجٹ کا اندازہ لگایا گیا تو خوش بختی نے مسکراتے ہوئے اِستقبال کیا، خسارہ کا منہ کالا ہو چکا تھا، ـــــــ برسوں کی جد و جہد اور کاوش کے بعد اب اِطمینان کی سانس نصیب ہوئی، اِضطراب اور بے چینی میں دامن خدا ہاتھ سے نہ چھوٹا تھا، اَب راحت و سکون کی زندگی ہے، درد کی کسک کے ساتھ "استغفراللہ" کی آواز نکلنا پھر بھی آسان ہے، لیکن دولت کی فراوانی میں "الحمدللہ" کہنا بہت دشوار ہے، کتنے اللہ کے نیک بندے، جو ہر الم کو ہنس ہنس کے ٹالتے رہے، جب دولت

آتے دیکھا تو سہم گئے اور بجائے خوش ہونے کے مضطرب ہو گئے ——

امام احمد بن حنبل پر تخویف کا کونسا تیر تھا جو نہ چلایا گیا، لیکن امام کے چہرۂ جمال پر جلال کی ایک بھی شکن پڑی؟ لیکن جب اسی امام پر روپیوں اور نوازشوں کی بارش ہونے لگی تو کس کی زبان سے یہ کلمات نکلے کہ "پہلا امتحان اتنا سخت نہ تھا جتنا یہ امتحان ہے"! —— آخر دولت سے یہ گھبراہٹ کیوں؟ عیش و آرام سے اس کھچاؤ کے کیا معنی؟ بس یہی کہ پرفضا حویلیوں میں رہکر اور نرم نرم گدّوں پر لیٹے، اکثر انسانی دماغ بخشنے والے کے احسان کو محو کر کے صرف بخشش ہی میں منہمک ہو جاتا ہے، یہیں سے خود فریبی اور حق ناشناسی شروع ہو جاتی ہے، —— بڑے صاحب ہمت ہوتے ہیں وہ لوگ جنکی نظریں رحمتوں کی فراوانی میں بھی "ارحم الراحمین" کی طرف اسی طرح لگی رہتی ہیں جیسی کہ مصیبت کے وقت "قاضی الحاجات" کی طرف جمی ہوئی تھیں ——

## بیتِ رب کی زیارت

قرآن کا اقرار ہے کہ "ان مع العسر یسرًا" ہر تنگی کے ساتھ فراخی اور ہر مصیبت کے بعد راحت مقدر ہے، محمد بہادر خاں نے تنگی کی ساعتوں کو آنیوالی فراخی کی امید میں مسکراتے گذار دیا، لیکن یہ کوئی نہ جانتا تھا کہ "فراخی" سے کیا فائدہ اٹھایا جانیوالا تھا، —— جونہیں معلوم ہوا کہ اس سال اتنی بچت ہو چکی ہے کہ بیتِ رب کی زیارت سے بہ آسانی مشرف ہو سکتے ہیں، تو اس عاشق صادق کے لیے اب گھر کا آرام تلخ ہو گیا۔ خود فرماتے تھے کہ "جب مجھے اپنی بچت کا حساب مل گیا تو میں نے اپنے منشی سے کہدیا کہ اس سال ہم زیارت کعبہ کا شوق رکھتے ہیں؟ منشی نے عرض کیا " حضور کو برسوں بعد اب ذرا سکون ملا ہے، دو ایک سال بعد ارادہ فرمائیں؟ محمد بہادر خاں رحمۃ اللہ علیہ نے ہنسکر کہا "کیا تم مجھے

اپنی عمر کی گیارنٹی دے سکتے ہو"ـــــــ یہ تھا عزم اور یہ تھے "فراخی" کے ارادے، نہ معلوم کتنے برسوں سے اِس شوق نے زندگی کو بے کیف کر رکھا تھا۔

محمد بہادر خاں کے پاس ارادہ اور عمل میں فاصلہ کبھی دیکھا نہ گیا، جس چیز کا ارادہ فرماتے، کرگزرتے ـــــــ ۱۹۳۱ء تھی کہ اس عَبد نے اپنے معبود کے گھر کی ٹھان لی، خود فرماتے تھے "کہ جب میں نے حج کا ارادہ ظاہر کیا تو علاوہ رفیق حیات کے میرے بہت سے عزیزو اقربا نے اپنے اپنے اِشتیاق کا اِظہار کیا، ایک بڑی پھوپی نے کہا کہ بیٹا تم نہ لیجاؤ گے تو پھر ہمارے لیے کونسا موقع رَہ جاتا ہے"ـــــ غرض جس جس نے ارادہ ظاہر کیا سب کو اثبات ہی میں جواب دیتا رہا، اور اس طرح الحمدللہ جس وقت ہم یہاں سے چلے ہیں تو صرف میرے خاندان والوں ہی کی تعداد اسّی کے قریب تھی"ـــــــ اس سال حکومت حیدرآباد نے بھی انہی کو قافلہ سالار مقرر کیا ـــــــ خوش نصیب تھا وہ قافلہ جس کو ایسا قافلہ سالار ملا۔ ـــــــ

ایک دن تفسیر بیان فرما رہے تھے، آیتیں حج سے متعلق تھیں چونکہ زیارت کعبہ سے مشرف تھے، ہر چیز نہایت وضاحت سے بیان ہو رہی تھی، اسی دوران میں کچھ حاجیوں کا ذکر آیا کہ دوران سفر بعض لوگ عوام کو فضائل و برکاتِ حج سنایا کرتے ہیں، ایک صاحب کہنے لگے " نواب صاحب سفر حج میں میں بھی آپ ہی کے ساتھ تھا، روزانہ شام میں جہاز پر آپ کی تقاریر ہوتی تھیں"ـــــــ محمد بہادر خاں (علی اللہ مقامہٗ) مسکرائے، فرمانے لگے "لیجئے یہ ہمارے ساتھی نکل آئے ـــــــ جی ہاں جناب، میری زبان ہمیشہ چلتی رہی ہے، روزانہ شام کے وقت میں ڈک ( Deck ) پر

نکل آتا، سب لوگ جمع ہو جاتے اور میں فضائل حج بیان کیا کرتا تھا ـــــــ واقعی اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل شاملِ حال رہا کہ میں ہر اعتبار سے حاجیوں کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکا، مجھ پر سمندر کی آب و ہوا کا کوئی برا اثر نہ ہوا، اس لیے بھی مجھے دوسرے لوگوں کی جو بیمار ہو گئے (Sea-Sick) تھے خدمت کا موقع ہاتھ آیا، اللہ تعالیٰ ہمیشہ ہی مجھ پر بڑے مہربان رہے ہیں ـــــــ اس گفتگو سے واضح ہو گیا کہ دورانِ سفر اس قاید قافلہ نے قافلہ والوں کی کتنی خدمتیں انجام دیں، دوائیں پلائیں تاکہ جسم صحت پا جائے، تقاریر کیں تاکہ نفس پاک ہو جائے، اِشتیاق بڑھتا جائے، جسم کا خیال رکھا گیا تاکہ چشمۂ فیض تک پہنچ سکیں، روح کی طرف توجہ کی گئی تاکہ فیوض سے اِستفادہ کی صلاحیت پیدا ہو۔

غرض اس طرح خدمت کرتے ہوئے اور بندگی کے سبق کو زیادہ سے زیادہ ازبر کرتے ہوئے معبود کے گھر پہنچے ـــــــ مدتوں کا اشتیاق تھا، برسوں کی آرزو تھی، اب جو دیدارِ کعبہ نصیب ہوا تو آنکھیں ہٹائے نہ ہٹتی تھیں۔ خود فرماتے تھے کہ "میں نے زیادہ معاوضہ دیکر ایک ایسا مکان خانۂ کعبہ سے قریب ہی حاصل کر لیا تھا جس کی کھڑکی ٹھیک اس کے مقابل کھلتی تھی، اِسطرح جب میں گھر میں ہوتا تب بھی برابر دیدار سے مشرف رہتا؟" اللہ اللہ کیا شوق ہے، کیا عشق ہے، رات کا بڑا حصہ بھی یونہیں صرف نظر ہوتا۔

سنتے ہیں کہ حج کا معاملہ بالکل ویسا ہی ہے جیسے ایک بھٹی جس میں اگر سونا ڈالدو تو کندن بن کر نکلے اور کھوٹ ہو تو جل کر راکھ ہو جائے۔ محمد بہادر خاں کی آئندہ زندگی اس بات کا ثبوت دیتی ہے کہ حج کر کے ان کے قلب نے بہت جلا پائی۔ ان کا عشق پختہ تر ہو گیا۔ ان کی صلاحیتیں زیادہ نمایاں ہو گئیں ـــــــ

بہ ہر کیف یہاں سے اس بارگاہ میں پہنچے جس کی اتباع سے حیات کے سامان فراہم کئے جاتے رہے، جس کا نام لیتے ہی جسم کے گوشہ گوشہ میں بجلیاں کوندجایا کرتیں، آنکھیں اشک ریز ہوا کرتیں اور دل دکن کی فضا سے اچاٹ ہوجایا کرتا تھا، مدینہ کی حیات پرور فضائے بلبل ہزار داستان کو عشق کے کیسے کیسے سُریلے نغمے سکھائے ہوں گے، ادھر عشق ادا شناس کی نیازمندیاں اُدھر حسن عشق پرور کی کرم فرمائیاں نہ جانے طلب وعطاء کی کیا سرگوشیاں رہیں۔ ع

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغبان
بلبل چہ گفت وگل چہ شنید و صبا چہ کرد

**ابن سعود اور امان اللہ خاں**

غرض عشق کی کیا کیا گزارشیں ہوئیں اور بارگاہِ حسن سے کیسی کیسی سرفرازیاں ہوئیں وہ محمد بہادر خاں کا دل ہی جانے، یہ وہ راز تھا جو ہم پر افشاء نہ ہوا۔ لیکن مرحوم نے فکر کو یہاں بھی نہ چھوڑا، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے قدیم وجدید مراسم کو گہری نظر سے دیکھا اور حاجیوں کی حالت سے مسلمانان عالم کی کیفیت کا صحیح اندازہ لگایا۔ ابن سعود سے ملاقاتیں بھی ہوئیں —— ایک مرتبہ سوانح نگار کی موجودگی میں ابن سعود کا ذکر آیا تو مرحوم نے صرف دو تین جملے فرمائے جو اس وقت یاد نہیں لیکن ان کا منشاء ضرور محفوظ ہے وہ یہ کہ ابن سعود کی حکومت نیم اسلامی طرز کی حکومت ہے (یعنی اندرونی انتظامات میں اسلامی قوانین کی پابندی کی جاتی ہے لیکن حقیقی اسلامی روح جو تمام مسلمانان عالم کو بھائی بھائی بنا دے، وہ یہاں بھی مفقود ہے) اور اس سے کچھ توقع بھی نہیں رکھی جا سکتی۔

ابن سعود ہی کے گھر پر مرحوم کی سابق شاہ افغانستان امان اللہ خان سے بھی ملاقات ہوئی۔ امان اللہ خاں نے مرحوم سے دریافت کیا کہ "ہندوستان کے مسلمان میری نسبت کیا کہتے ہیں؟" مرحوم نے فرمایا "میں صرف اپنی رائے ظاہر کرسکتا ہوں" امان اللہ خاں نے نہایت توجہ کے ساتھ اس کی خواہش کی، مرحوم نے فرمایا "آپ ایک ایسے بادشاہ تھے جو سڑک بنائے بغیر اس پر نئے زمانے کی موٹر دوڑانی چاہتے تھے، آپ کی جلد بازی کی وجہ سے آپکی حکومت کی موٹر ٹوٹ گئی" ـــــ اس گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرحوم کو کتنی اصابت الرائے حاصل تھی اور ہر چیز کا کس غور و فکر سے مطالعہ فرماتے اور اس کی اصلی غائت معلوم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

غرض زیارت کعبہ اور زیارت مدینہ سے فارغ ہو کر مرحوم نے اپنے قبیلہ والوں کو حیدرآباد روانہ فرمادیا اور خود تنہا ممالک اسلامی کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

# اَرض خُدا کی سَیر

---

"سِیرُوا فی الارض" کسی بشر کا قول نہیں، حدیث شریف بھی نہیں بلکہ قرآنی آیت کا ایک ٹکڑا ہے، زمین کے سیر کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے، لیکن کس لیے؟ تفریح طبع کی خاطر، شہوانی جذبات کے بہلانے کے لیے، دولت کو کسی نہ کسی طرح صرف کرنے کے لیے، اگر یہ نہیں تو پھر کیا اس لیے کہ جرمنی، انگلستان اور امریکہ جا جا کر پی، ایچ، ڈی اور ڈی، ایس سی

وغیرہ کی ڈگریاں حاصل کی جائیں؟ ــــــ نہیں ہرگز نہیں، اس میں سے کوئی مقصد بھی مقصود قرآن نہیں اور نعوذ باللہ ایسے فضول مقاصد ہو بھی کیسے سکتے ہیں۔ زمین کی سیر کی ترغیب دلانے کا منشاء دوسروں کی حالت دیکھکر اپنے حال کو سنوارنا ہے، جھوٹوں، مکاروں، خدانا شناسوں اور دنیائے دوں کے بندوں کی کیفیت کو دیکھکر اس سے اپنے لیے سامان عبرت فراہم کرنا ہے ــــــ لیکن آج جبکہ مسلمان ہی اسلام سے ناآشنا، حامل قرآن ہی تعلیمات قرآن سے بے بہرہ اور حامل حق ہی، باطل کے پرستار بن چکے ہیں، تو سیروا فی الارض کا مقصد بجز اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ ان مختلف مقامات کے بسنے والے مسلمانوں کی حالت کا مطالعہ کیا جائے، تاکہ ان کی زبون حالی اور شکستگی کے اسباب معلوم کئے جائیں، ان کے جین اور ان کی پستی کے موثرات کا پتہ لگایا جائے، ان پر باطل کے سحر کی فسوں کاری کی وجہ معلوم کی جائے، اور یہ سب کچھ اسلئے نہیں کہ ایک مقالہ تیار کرکے دنیا سے داد حاصل کی جائے کسی مکتب سے ڈگری لی جائے بلکہ اس لیئے تاکہ ان بیماریوں کو معلوم کرکے ان کے علاج کی طرف عملاً اقدام کیا جائے ــــــ جس نے اس مقصد اور اس ارادے کے تحت سیر کی وہ مواخذے سے بری ہے ورنہ پھر نفس کی غلامی چاہے کتنے ہی رنگین خاکے بنائے اور چاہے دنیا کے چپہ چپہ میں پھرائے سوائے گھاٹے کے کچھ فایدہ نہیں۔

محمد بہادر خاں رح کے پاس ایک بے تاب دل تھا، جو مسلمانوں کے درد سے ہر آن تڑپتا رہتا تھا، وہ ایک اعلیٰ دماغ رکھتے تھے جو خوب کو ناخوب سے، صحیح کو غلط سے اور بجا کو بیجا سے ممیز کرسکتا تھا،

ان کی نظر قرآن و تاریخ اسلام میں عمیق تھی، اس لئے مسلمانوں کی پستی کے صحیح اسباب اور ان کی ترقی کا بہترین حل بتا سکتی تھی، ان میں کام کرنے کا بے پناہ جذبہ تھا جو ہر خیال کو ارادہ اور ہر ارادہ کو عمل کی صورت میں ڈھال دیتا تھا ــــــ قدرت کے ان عنایات کے ہوتے ہوئے اگر وہ ممالک اسلامی کی سیر نہ کرتے تو عملی کفران نعمت تھا۔

حج سے فارغ ہوتے ہی مرحوم نے سفر بلاد اسلامیہ کی ٹھانی، مسلسل سفر کرتے رہے اور چھ مہینے میں عراق، شام، فلسطین، مصر، قسطنطنیہ، انگورہ، وسط ایشیا، ایران، ترکی اور افغانستان وغیرہ ممالک کو بہت گہری نظر سے دیکھا، ــــــ حسن نظامی صاحب نے بہت صحیح لکھا ہے:۔

"موجودہ زمانہ میں بہت سے مسلمانوں نے اسلامی ممالک کی سیر کی اور سفرنامے لکھے، جن میں ایک میں بھی ہوں اور مرحوم مولانا شبلی بھی ہیں اور محبوب عالم صاحب ایڈیٹر پیسہ اخبار بھی ہیں اور بھوپال کے ایک مسلمان بھی ہیں جنھوں نے اسپین کا بہت اچھا سفرنامہ لکھا ہے اور مرحوم حافظ عبدالرحمٰن امرتسری بھی ہیں، ان کے علاوہ اور بھی بہت سے ہیں لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے ایک ہی وقت میں تمام اسلامی دنیا کے ملکوں اور قوموں کو دیکھا ہو اور مذہبی اور سیاسی اور معاشرتی مقاصد سامنے رکھکر دیکھا ہو، اس لحاظ سے نواب بہادر یار جنگ سب سیّاحوں سے اعلیٰ ہیں" (نواب بہادر یار جنگ کا سفرنامہ نوشتہ خواجہ حسن نظامی) آگے چلکر لکھتے ہیں:۔" قدیم ابن بطوطہ کی عظمت و عزت کو باقی رکھنے کے لیئے نواب بہادر یار جنگ کو ابن بطوطہ سے زیادہ نہیں بلکہ ابن بطوطہ کی برابر سمجھ کر نواب ابن بطوطہ خطاب دیتا ہوں . . . . .

میرا خیال ہے کہ حیدرآبادی ہی نہیں اور ہندوستان ہی نہیں بلکہ تمام دنیا کے موجودہ مسلمانوں میں کسی مسلمان نے ایسا جامع اور وسیع سفر اس زمانہ میں نہیں کیا۔" ——— (ایضاً)

لیکن افسوس ہے کہ اس وسیع اور جامع اور اہم سفر کی یادداشتیں جو مرحوم کے پاس موجود تھیں، ان کی زندگی میں سفرنامے کی شکل میں منظرِ عام پر نہ آسکیں، صرف جتنا ان کی زبانی سنا، بعضوں نے قلمبند کرلیا تھا، مولف سوانح ہذا کو جتنی معلومات بہم پہنچ سکیں وہ سپردِ قلم ہیں۔ (اکثر حصہ حسن نظامی صاحب کے نوشتہ، سفرنامے سے لیا گیا ہے، جو مصدقہ ہے اور بعض ذاتی معلومات بھی بڑھائے گئے ہیں)۔

**فلسطین** اس کی نسبت مرحوم اچھا خیال رکھتے ہیں، یہاں کے مشہور لیڈر امین الحسینی کے متعلق مرحوم کا خیال ہے کہ یہ ایک ایسے لیڈر ہیں جن کی تمام اسلامی دنیا میں ضرورت محسوس ہو رہی ہے، ان کا علم بھی صحیح، احساس بھی صحیح، اور عمل بھی صحیح ہے اور ان کے اندر عوام و خواص کو کشش کرنے کی قابلیت بھی بہت زیادہ ہے، مرحوم نے مصر، شام، عراق اور فلسطین کی عرب اقوام کو دیکھنے اور ان کے لیڈروں سے ملنے کے بعد یہ رائے قایم کی کہ اس وقت ایک عالمگیر اخوت اور عالمگیر مفادِ اسلامی کو سمجھنے والا اور برتنے اور عمل کرنے کا مقصد رکھنے والا فلسطین ہی میں ایک شخص ہے اور وہ " امین الحسینی ہے۔

**یہودی تحریک** یہودی تحریک کو بھی بیت المقدس میں نہایت عمدہ بصیرت اور بصارت سے دیکھا، اور ان کی نوآبادیاں بھی دیکھیں۔

**تل ابیب۔** آبادی جو یہودیوں نے یافہ کے قریب بنائی ہے، اس کو بھی دیکھا اور اس کی موزونیت اور خوشنمائی اور ان کے کتب خانہ کو بھی دیکھا، جس میں اس وقت تک دو لاکھ کتابیں جمع ہو چکی تھیں، ان کی علمی خدمات کو بھی دیکھا جس کے سلسلہ میں ایک عربی لغت کا حال معلوم ہوا، جس کو یہودی آٹھ برس سے تیار کر رہے تھے اور اس وقت تک حروف " ح " تک پہنچے تھے،—— بحیثیت مجموعی مرحوم کا خیال ہے کہ "یہودیوں کا فلسطین سے خارج کرنا اتنا آسان نہیں جتنا یہاں کے عربوں نے سمجھ رکھا ہے۔"

**شام** شام کا ملک اس وقت فرانس کے قبضہ میں ہے مگر وہاں اسلامی اور قومی تحریک اٹھ رہی ہے اور جوں جوں اس تحریک کو دبانے کی کوشش کیجاتی ہے اس میں زیادہ جوش پیدا ہوتا ہے لیکن جیسا کہ ہر ملک کے مسلمانوں میں ایسے افراد پائے جاتے ہیں جو ذاتی مفاد کے لئے قومی مفاد کو فروخت کرنے کا پیشہ کرتے ہیں، شام میں بھی موجود ہیں اور انہی کی وجہ سے قومی تحریک کے راستہ میں روڑے اٹکتے رہتے ہیں۔

**مصر** مصری تحریک کے موجودہ رہنما مصطفےٰ نحاس پاشا خود مرحوم سے ملنے ان کی قیام گاہ پر آئے اور یہ بھی ان سے ملنے گئے، اور مصری قوم کی والدہ، سعد زاغلول پاشا کی اہلیہ جن کو مصری لوگ، مصر کی ماں، کہتے ہیں، خود ملنے آئیں اور مرحوم بھی ان کے ہاں گئے، حکومت پسند پارٹی کے لیڈر صدقی پاشاہ نے بھی ملاقات کی۔ اور مصر کے مشہور اخبارات کے ایڈیٹروں نے بھی ملاقاتیں کیں اور خیالات معلوم کرکے شائع کئے، مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ مصر کا پریس بہت ترقی یافتہ ہے، چنانچہ یہ واقعہ مولف نے خود مرحوم کی زبانی سنا کہ جب وہ پہلی بار نحاس پاشاہ سے ملنے گئے

اور گفتگو چند خاص اہم مسائل پر ہونے والی تھی، تو گمان ہوا کہ شاید ٹھیک طور پر عربی زبان میں اظہار خیال نہ کر سکیں گے، اس لئے ایک قادیانی مبلغ کو جو وہاں موجود تھے ترجمان کی حیثیت سے ساتھ لے گئے، مرحوم فرماتے تھے کہ "چند منٹ تک گفتگو ہوتی رہی، میں نے محسوس کیا کہ میرے ترجمان صاحب میری ٹھیک ٹھیک ترجمانی نہیں کر رہے ہیں، اس لئے میں نے ان کو درمیان سے الگ کر دیا اور نحاس پاشا سے کہا کہ بولنا میرا کام ہے سمجھنا آپ کا کام ہے، جمع کو واحد، واحد کو تثنیہ اور مذکر کو مونث بولوں تو معاف فرمائیے اور مفہوم سمجھ لیجئے"۔ اس کے بعد راست گفتگو بہت دیر تک ہوئی۔ دوسرے روز نواب صاحب کو بہت تعجب ہوا کہ مصر کے اچھے اخباروں میں ان کی تصویر چھپ چکی ہے اور ایک تعارفی نوٹ لکھا گیا ہے جس کا عنوان یہ تھا "حیدرآباد کا ایک نواب جو عربی فصلح میں گفتگو کرتا ہے"۔ اس واقعہ سے مرحوم فرماتے تھے کہ وہاں کا پریس نہایت ترقی یافتہ ہے، ہر خبر بہت جلد پورے ملک میں پھیل جاتی ہے۔

ایک دفعہ نحاس پاشا مرحوم سے ہوٹل میں ملنے آئے، جب واپس ہونے لگے تو مرحوم ان کو رخصت کرنے ہوٹل سے باہر آئے، ہزاروں مصری جمع تھے "یحییٰ نحاس پاشا" (نحاس پاشا زندہ باد) کے نعرے لگانے لگے، مرحوم فرماتے تھے کہ نحاس پاشا اور "والدۂ مصر" تمام مصر میں مقبول ہیں۔

**ترکی** مرحوم نے ترکی کے نئے، پرانے تمام شہر دیکھے، فرماتے تھے کہ سب عورت مرد یورپین لباس میں ہیں، مرحوم سرخ رنگ کی ترکی ٹوپی اوڑھتے تھے، بڑی عمر کی ترکی عورتیں اس ٹوپی کو محبت کی نظر سے

دیکھتی تھیں، جوان عورتیں حقارت کی نظر ڈالتی تھیں اور سنجیدہ اور تعلیم یافتہ مرد حسرت سے دیکھتے تھے، چنانچہ ایک ترک تخلیہ میں مرحوم کے پاس آیا، اور خود ہی دروازہ بند کرکے مرحوم کی طرف بڑھا، فرماتے تھے کہ "مجھے اس کی نیت پر شبہ ہوا، میں نے خفیہ طور پر اپنی پستول سنبھالی اور کچھ آیتیں پڑھنے لگا، لیکن میں نے دیکھا کہ اس نے آگے بڑھ کر نہایت لجاجت کے ساتھ مجھ سے لال ٹوپی مانگی، میں نے اجازت دی، اس نے اپنی یورپی ٹوپی اتار کر وہ ٹوپی اوڑھ لی اور آئینہ میں اپنی صورت دیکھکر ایک ٹھنڈا سانس لیا" مرحوم کے سوال پر کہا کہ "میرا بادشاہ یورپین ٹوپی کو پسند کرتا ہے، اس لئے میں بھی اس کو پسند کرتا ہوں لیکن میرا دل قدیم ترکی ٹوپی ہی کو پسند کرتا ہے"

**انگورہ اور قسطنطنیہ**

قسطنطنیہ کے ایک قہوہ خانہ میں مرحوم کے قریب ایک ترک خاندان یورپین لباس میں بیٹھا تھا، مرحوم نے ترک عورتوں کے یورپین لباس کے متعلق کچھ گفتگو فرمائی تو ایک جوان لڑکی نے اپنے بھائی سے کہا کہ یہ شخص مجھے مسافر معلوم ہوتا ہے اس لئے ہمارے لباس کو دیکھکر پوچھتا ہے کہ ہم مسلمان ہیں یا نہیں، کہو الحمد للہ ہم سب مسلمان ہیں اور ہمارے رگوں میں جو خون ہے وہ اب تک اسلام پر قربان ہونے کے لئے تیار رہے لیکن یہ مسافر انگورہ اور قسطنطنیہ کو دیکھکر ترکوں کی حالت کا اندازہ نہ لگائے، یہ دونوں شہر تو دیوانے ہوگئے ہیں، ترکوں کی اصلی حالت دیکھنی ہے تو اناطولیہ جائے وہاں اصلی ترک نظر آئیں گے۔ مرحوم فرماتے تھے کہ میں جب اناطولیہ گیا تو واقعی وہاں ترکوں کا قدیم لباس بھی موجود ہے، لمبی ڈاڑھیاں بھی ہیں، عورتوں کا پردہ بھی ہے اور مسجدیں بھی ہیں۔

**میلاد النبی کی رات** | ۱۲ ربیع الاول کی شام کو قسطنطنیہ میں تھے، یاد نہ تھا کہ اس روز ۱۲ تاریخ تھی، یکایک تمام مسجدوں کے میناروں پر برقی روشنی ہوگئی اور میں نے حیران ہوکر اسکی وجہ پوچھی، ترکوں نے کہا کہ آج ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کا دن ہے۔

**لیکن مسجد خاموش** | لیکن اسی شام کو مرحوم مسجد ایا صوفیہ میں نماز کے لئے گئے تو ہر طرف سناٹا تھا، ایک ترک کچھ وظیفہ پڑھ رہا تھا، ایک نماز پڑھنے آیا تھا، اور ایک نماز پڑھکر جارہا تھا۔ اتنی بڑی تاریخی مسجد اور مصلیوں کا یہ حال! لیکن جو مسجدیں آبادی میں ہیں وہاں بڈھے ترک نماز کے لئے جاتے ہیں اور مسجدیں بھر جاتی ہیں

**ہندوستانیوں سے نفرت** | ترکوں کی موجودہ حکومت کو ہندوستانیوں سے سخت نفرت ہے، مرحوم نے مصطفےٰ کمال پاشا سے انگورہ میں (جہاں وہ آئے ہوئے تھے) ملاقات کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی، پھر دوسرے شہر میں جہاں مصطفےٰ کمال گئے، وہاں جاکر کوشش کی لیکن پھر بھی ناکام رہے، وزیر خارجہ نے ہر دفعہ انکاری جواب دیا۔ عوام سے معلوم ہوا کہ ترکی حکومت کے اراکین ہندوستان کے بعض جاسوسوں کی وجہ سے ہندوستانیوں کو شک اور نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

عربی حروف کی جگہ لاطینی حروف رائج ہو رہے تھے، مرحوم کو مایوسی ہوئی جب انھوں نے عربی حروف پسند کرنیوالوں میں کسی عملی اقدام کی خواہش نہ دیکھی، اگر حکومت لاطینی حروف کو رائج کر رہی ہے تو پبلک میں

ایسے افراد ہونے چاہئیں تھے جو عربی حروف کے تحفظ کے لئے ایسی تدابیر اختیار کریں جو قانون حکومت کے خلاف بھی نہ ہوں اور عربی حروف کا تحفظ بھی ہو جائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دینی اعتبار سے ترکی قوم ایک بڑے خطرہ کی طرف جا رہی ہے۔ تاہم ہر یورپین نما ترک میں اسلام کا اتنا اثر ہے کہ جب کسی سے پوچھو کہ تم مسلمان ہو تو وہ بڑے جذبے اور لحن کے ساتھ جواب دیتا ہے الحمد للہ میں مسلمان ہوں۔

انگورہ۔ یہ موجودہ حکومت کا پایہ تخت اور ترقی پذیر شہر ہے، یہاں بھی مرحوم نے یورپی تمدن ہی کو سرایت کئے ہوئے پایا، البتہ عسکی شہر وغیرہ جیسے پرانے شہروں میں قدیم تمدن بھی پایا گیا۔

ایران۔ یورپی تمدن کی ہوا نے ایران کے تمدن کو بھی مسموم کر رکھا ہے، عورت و مرد دونوں میں یورپین بننے کا اشتیاق ہے ان کے اندر وطنی تحریک بڑھ رہی ہے اور اسلامی احساس کم ہو رہا ہے۔ ان کے دینی پیشوا بھی وطنی رنگ کی طرف جا رہے ہیں، قاید ملت مرحوم، رضا شاہ پہلوی سے نہ مل سکے کیونکہ وہ اس وقت موجود نہ تھے، البتہ وزراء سے ملاقاتیں ہوئیں، موجودہ ایران کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ وہ قدیم مہمان نوازی کے افسانوں سے خالی ہے، ایرانی بہت زیادہ مبالغہ کرتے ہیں، ان کی آنچ برسوں تک ختم نہیں ہوتی، گویا ان کی ضمیر اور ان کی زبان کا فاصلہ بہت بڑھ گیا ہے، اور وہ ایران کے قدیم زرتشتی مراسم اور خیالات کو بھی پسند کرنے لگے ہیں، ان میں سے بعض آزادی کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہم نے شیعہ مذہب اسی واسطہ اختیار کیا تھا کہ مسلمانوں کی عالمگیر اخوت سے علیحدہ اور ممتاز رہیں، ہم ہی نے حضرت علی رض کو بہت بڑا بنا دیا اور ہم ہی نے

حضرت حسین رضؓ کو اتنا زیادہ مشہور کیا۔

**وسط ایشیا** مرحوم نے ایران کے بعد وسط ایشیا کا ایک حصہ دیکھا، ہرات کے مسلمانوں کا اچھا اثر ہوا، انھوں نے کہا کہ جس طرح شام مصر، فلسطین اور عراق ایک ہادی و مصلح کے ظہور کا انتظار کر رہے ہیں اسیطرح وسط ایشیا کے مسلمانوں میں بھی تبدیلی و ترقی کی زبردست خواہش محسوس ہوئی، اور اسلامی جذبہ پایا۔

**افغانستان** یہاں غازی نادرشاہ سے کئی دفعہ ملاقات ہوئی۔ اور افغانوں کے سب عام و خاص لوگوں سے ملاقاتیں کیں مرحوم کا خیال ہے کہ مہمان نوازی اور اسلامی اخلاق کے اعتبار سے افغانستان تمام ملکوں سے بڑھا ہوا ہے اور اس کے اندر اسلامی جذبات اور اسلامی غیرت وحمیت کی خواہش کے ساتھ ہی نئی ترقیوں اور تبدیلیوں کی بھی زبردست خواہش پائی جاتی ہے، مرحوم، غازی نادرشاہ کے بہت مداح تھے، ان کی متانت، سنجیدگی، دینداری، سیاسی تدبر اور ان کے عمدہ انتظامات کا مرحوم پر بہت اچھا اثر ہوا۔

---

بہ ہرکیف مرحوم نے ان مسلمانانِ عالم کو جو یورپین تمدن اختیار کر چکے ہیں یا اس کے شائق ہیں ایک عام مفلسی میں مبتلا پایا کیونکہ ان کے مصارف بڑھ گئے ہیں اور آمدنی میں ترقی نہیں ہوئی اور نہ ہی وہ ترقی کے ذرائع کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور نہ ان کے پاس یہ ذرایع موجود ہیں، ایک مرتبہ مولف ہذا کے سامنے کچھ اسی قسم کا ذکر چھڑا تھا، مرحوم نے فرمایا کہ ہندوستانیوں میں اس گئی گزری حالت میں بھی دین کا پاس اور اسلامی تعلیمات کی قدر

بہ نسبت اور ممالک کے مسلمانوں کے زیادہ ہے۔

غالباً اکتوبر ۱۹۳۱ء میں بلادِ اسلامیہ کا یہ سفر ——— جس کے متعلق افسوس ہے کہ زیادہ تفصیلات نہ مل سکیں ——— چھ مہینے بعد ختم ہوا۔ ہر جگہ کے علماء، اہلِ سیاست اور دیگر سربرآوردہ افراد سے ملاقاتیں ہوئیں، خود مرحوم نے اپنی قابلیت ذاتی کی بنا پر ہر جگہ نہایت اچھے اثرات چھوڑے، جس کا ثبوت مختلف ممالک کے جرائد ہیں۔ حاضر جوابی اور قابلیت کی ایک بات یاد آئی ——— مصری، ہندوستانی مسلمانوں سے اس بات میں سخت اختلاف رکھتے تھے کہ ہندوستانی قرآن پاک کا ترجمہ کرتے ہیں، درآں حالیکہ اردو زبان میں اتنی سکت ہی نہیں اور نہ کسی زبان کا دوسری زبان میں حقیقی معنی میں ترجمہ ہوسکتا ہے؛ ایک مرتبہ مرحوم جامعۂ اظہر کے پرنسپل کے ہاں مدعو تھے، پرنسپل صاحب نے طنز سے کہا کہ ہندوستانی تو قرآن مجید کا بھی ترجمہ کرتے ہیں! مرحوم نے فوراً جواب دیا "ترجمہ نہیں ترجمانی کرتے ہیں، اور اس میں کیا قباحت ہے؟" ——— اس پر پرنسپل صاحب کہنے لگے آپ نے بچا لیا۔"

غرض اس سفر کے بعد جب مرحوم واپس تشریف لائے تو مختلف مقامات پر اس سلسلے کی کئی تقریریں ہوئیں، انہی تقاریر سے متاثر ہو کر خواجہ حسن نظامی صاحب نے "نواب ابن بطوطہ" کے نام سے پکارا ——— مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اپنی معلومات زیادہ تر آیاتِ تکوینی ہی سے بڑھائی ہیں۔

# جذبِ اندروں کی کارفرمائیاں

کارِ پاکاں روشنی وگرمی است
کار دوناں حیلہ و بے شرمی است (رومیؒ)

عمر کے ابتدائی برس مجاہدۂ نفس میں صرف ہوئے (اور حقیقتاً یہ چیز تو زندگی کی آخری سانس تک جاری رہی) جب اختیار و اقتدار ملا تو جس طرح رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے " وانذر عشیرتک الاقربین " ((اے محمدؐ) ڈراؤ اپنے قریبی رشتہ داروں کو) کی تعمیل میں سب سے پہلے اپنے عزیزوں کو دعوتِ حق دی تھی۔ اس عاشقِ رسولؐ نے بھی اپنے گھر والوں ہی کی اصلاح کی۔ پھر جب بیت اللہ کی زیارت نصیب میں آئی تو نفس ، اور بھی صفا ہو گیا ، عشق کی آگ اور زیادہ بھڑک اٹھی

ممالک اسلامیہ کی سیر نے مسلمانوں کی بے راہ روی، ان کی اندھی تقلید، انکی خود ناشناسی اور خدا ناآشنائی کے گہرے داغ چھوڑے، ہر بازار میں جنس ایمان کی کمی دیکھی، ہر دماغ میں سودائے خام پایا؛ ترقی کے دعوے سنے، تنزل کے اعمال دیکھے۔ عقل نے سمجھایا، دل نے تصدیق کی کہ یہ تہ بہ تہ تاریکی بلا ایمان کی شمع جلائے دور نہ ہوگی، فضا کی یہ اندھیری کہر بغیر دل کا آفتاب چمکے زائل نہ ہوگی —— ہندوستان لوٹے تو دل کی اسی دھکتی ہوئی انگیٹھی کے ساتھ اور عزم کے اسی رسوخ کے ساتھ کہ جہاں تک ممکن ہو باطل کے خس وخاشاک جلا دیئے جائیں، اپنوں اور پرائیوں کو اسلامی تعلیمات کا حسین چہرہ دکھا کر بوالہوسی سے بچایا جائے —— اسی کا نام تو تبلیغ اسلام ہے، اور یہی شعار تو ہمیشہ سے پاکوں کا رہا ہے!

**تبلیغِ اسلام** | تبلیغ دین، مسلمانوں کا فرض، سیرت طیبہ سے اس کی اہمیت بالکل واضح، لیکن آج چند نفوس قدسیہ کو چھوڑ کر کتنے علماء اِس جانب متوجہ ہیں؟ کتنوں نے تو ہر بات میں رخصت ہی کو اپنا شعار بنا رکھا ہے، حالانکہ فتویٰ اور چیز ہے، تقویٰ کا مقام اور ہی ہے! —— لیکن یہ اعتنائی آج غلامی ہی میں نہیں ہے بلکہ اس وقت بھی برتی گئی جبکہ مسلمانوں کی حکومت ملک ہند میں شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی تھی —— مغلیہ دور میں تبلیغ کا کام (حکومت کی جانب سے) کتنا ہوا؟ صدہا برس کی حکومت پھر غیر مسلموں کی اکثریت، آخر کیا معنیٰ رکھتی ہے؟ مقصد یہ نہیں کہ کیوں تلوار کے زور سے اسلام پھیلایا نہیں گیا بلکہ منشا یہ ہے کہ "لا اکراہ فی الدین" کے قرآنی مسلک کو پیش نظر رکھکر اس کے سامان کیوں نہیں کئے گئے۔

یہ مسلمانوں کی تعداد جو اس وقت ہندوستان کے طول وعرض میں پھیلی ہوئی ہے، سب کی سب "درآمد" کا نتیجہ تو نہیں، "درآمد" تو بہت کم ہوئی باقی سب تبلیغ ہی کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس کا سہرا کن کے سر ہے۔؟ بادشاہوں کے یا بادشاہ نواز گلیم پوشوں کے؟ بابر ہمایوں، شاہ جہاں وغیرہ کے یا چشتیؒ، محبوب الٰہیؒ اور چراغ دہلویؒ وغیرہم کے؟ سلطان قلی قطب شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ کے یا بابا شرف الدینؒ اور خواجہ گیسو درازؒ کے؟

جو کام شاہوں سے نہ ہوا، وہ درویشوں نے کر دکھایا۔ وجہ یہ ہے کہ یہ کام "پاکوں" کا ہے، "حیلہ جو" اور "بے شرموں" کا نہیں، اِس بڑے کام کی اہمیت، اہلیت چاہتی ہے۔ ع

یہ خاکِ پاک ہر نااہل سے چھانی نہیں جاتی

سیرت طیبہ شاہد ہے کہ یہ راہ بغیر آبلہ پائی کے طے نہیں ہوتی، پھر کبھی ترغیب کی بیڑیاں آگے بڑھنے سے روکتی ہیں اور کبھی ترہیب کے آہنی قلعے، ارادوں کو پست کر دیتے ہیں —— خود عاشق رسول محمد بہادر خاں کی زبانی حیاتِ طیبہ کے اس پہلو کو سنئے :—

"آیئے ان کیؐ حیات طیبہ کے صرف اس پہلو پر غور کریں کہ آپؐ نے فریضۂ بلاغ کو، جو ان کا مقصدِ حیات تھا، اور صرف جس کے لیئے وہ مبعوث کئے گئے تھے، انھوںؐ نے کس طرح ادا کیا اور ہمارے لئے اپنی زندگی کا کیا نمونہ چھوڑ گئے —— وہ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) جو عبداللہ کے یتیم کی حیثیت سے خاندان بنی ہاشم کے چشم و

چراغ تھے، وہ محمدؐ جن کو عبد المطلب کے پوتے اور بعد ابو طالب کے بھتیجے کی حیثیت سے کوئی کڑی نگاہوں سے نہ دیکھ سکتا تھا، وہ محمدؐ جن کے حربِ فجار میں تیر چن چن کر نبرد آزماؤں کو دینے کی ادا کہ والوں کے دل چھین چکی تھی، وہ محمدؐ جن کا تنصیب حجر اسود کا فیصلہ سرکشانِ قریش کو اسیر کمند محبت کر چکا تھا، وہ محمدؐ جن کی صداقت کی قسم کھائی جاتی تھی، وہ محمدؐ جن کی امانت میں شبہ کرنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ جب خدا کے اس آخری پیغام کو سنانے کے لئے صفا کی چوٹیوں پر چڑھتے ہیں اور آل غالب کو آنے والے خطرات سے جو عذاب الٰہی کی صورت میں نمودار ہوتے ڈراتے ہیں تو قوم نے دیکھا اور تاریخ نے شہادت دی کہ انؐ کے روئے انور پر مکہ کی خاک اڑائی گئی، انؐ کے پائے نازک کی خار مغیلاں سے تواضع کی گئی، انؐ کی گردنِ اقدس پر اونٹ کی غلاظت بھری اوجھ رکھی گئی۔ خلیلؑ و ذبیحؑ کا وطن ان کے پوتےؐ پر تنگ کر دیا گیا، انؐ کے سر کے لئے انعام مقرر کئے گئے ——— کیا اِن سب باتوں میں چشم بینا کے لئے روشنی اور قلب فہیم کے لئے سبق نہیں ہے کہ اس دنیا میں حق و صداقت کا پیغام پہنچانا، طاغوتی طاقتوں کو دعوت پیکار دینا ہے اور شیطان کی ذریات کو آمادۂ جنگ کرنا ہے" ——— (خطبۂ صدارت آل انڈیا تبلیغ اِسلام کانفرنس، بمبئی ۱۹۳۸ء)

محمد بہادر خاں (رحمتہ اللہ علیہ) کے سامنے سیرت کے تمام پہلو تھے اور سچ پوچھو تو کس کے آگے نہیں؟ لیکن ان کو اس سے عشق تھا، ـــــ ۱۹۲۷ء میں ایک مجلس انجمن تبلیغ اسلام کی بناڈالی اور مسلسل تین سال تک حیدرآباد کے گاؤں گاؤں اور موضعہ، موضعہ کے دورے کئے، مشقیں برداشت کیں لیکن اپنا کام کئے گئے ـــــ طرز تبلیغ وہی قرآنی رہا، " لا اکراہ فی الدین " کے تحت صرف اسلام کے محاسن بیان فرماتے، غرض نہ شہرت سے تھی نہ عزت سے، صرف شفقت کا جذبہ تھا جو نرم نرم بستروں اور عالی شان ڈیوڑھی سے نکالکر گاؤں گاؤں پھرا رہا تھا،...... اس کی لذت انھیں کے دل کو معلوم!

غرض بیس پچیس نہیں، سو، دو سو نہیں بلکہ تقریباً پانچ ہزار (۵۰۰۰) بے دین اس مرد حق کے ذریعہ راہ حق پر آگئے۔ ایک کافر کو کوئی شخص اسلام پر لے آئے تو آخروی اجر کے کتنے سامان مہیا ہوجاتے ہیں چہ جائیکہ یہاں تو (۵۰۰۰) افراد مسلمان ہوگئے، خود مرحوم تحدیث نعمت کے طور پر فرمایا کرتے تھے کہ " الحمدللہ میرے ذریعہ پانچ ہزار (۵۰۰۰) افراد اسلام سے ہم آغوش ہوئے " ـــــ اور بحیثیت مجموعی اس انجمن کے ذریعہ تو (۲۰۰۰۰) بیس ہزار کافر، مسلم ہوگئے۔

مرحوم کے اس بڑھتے ہوئے کام کو دیکھکر حاسدوں کو تکلیف ہوئی چنانچہ ایک ڈھونگی مبلغ صاحب کو میں نے خود یہ کہتے سنا کہ " بہادر یار جنگ کی تبلیغ اسلام کے چہرہ پر ایک داغ ہے " جب میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے " وہ عام اچھوتوں میں تبلیغ کرتے ہیں اس لئے بہت جلد یہ لوگ مسخر ہوجاتے ہیں، اور اس کی وجہ سے ان کے لیڈروں اور مذہبی پیشواؤں کو

شکایت پیدا ہوتی ہے کہ اگر مسلمان کرنا ہے تو ہمارے سامنے آئیں، اِن جاہلوں کو بہکا لیجانا کونسی مشکل بات ہے، اِس طرح اس سے خود ہم پر حرف آتا ہے" پھر شیخی سے کہنے لگے "ہم تو بڑے بڑے برہمنوں اور پادریوں کو پکڑتے ہیں" ـــــ اِس کا جواب بجز اس کے کیا ہوسکتا تھا کہ ع

برایں عقل و دانش بباید گریست

غرض اس قسم کے اعتراضوں کے علاوہ چند فتنہ انگیز مخالفین نے غلط تشہیر کرکے ان کی شکایات پولیس کے اعلیٰ حکام تک پہنچائیں ـــــ پولیس نے اس معاملہ میں دست اندازی شروع کی اور اپنی رپورٹ میں اضلاع اور تعلقات کے شدھی اور تبلیغی کام کو فرقہ وارانہ کشیدگی کا باعث قرار دیا۔ قاید ملتؒ نے اس شبہ کے ازالہ کے لیئے ایک خط ناظم کوتوالی (مسٹر ہالنس) کو لکھا جو ذیل میں درج ہے:-

"کوتوالی اضلاع سرکارعالی کی رپورٹ نظم ونسق بابتہ ۱۳۴۶ف کے مطالعہ کا موقعہ ملا، نیز مقامی اخبارات میں بھی اس کے اقتباسات شایع کئے گئے ـــــ

اس وقت آپ کو مخاطب کرنے سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوتوالی کی عام رپورٹ پر تنقید کروں میں صرف فقرہ ۵ کی دوسری سطر کی طرف آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں، جس میں فرقہ وارانہ کشیدگی کی بڑی وجہ آپ نے تحریک شدھی کے ساتھ ساتھ تبلیغ کو قرار دیا ہے۔ چونکہ ۱۳۴۶ف میں منظم تبلیغی مساعی صدر مجلس اسلام کی طرف سے ہوتی رہی ہے، اس لیئے

عام طور پر آپ کی اِس تنقید سے وہی تبلیغی کوشش مراد لی جارہی ہے۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ فرقہ وارانہ کشیدگی کو تبلیغ کی طرف منسوب کرنا کسی طرح درست نہیں ہے۔ صدر مجلس تبلیغ اسلام کی جانب سے تبلیغ صرف چار اضلاع میں ہوئی ہے۔ تلنگانہ کے اضلاع ورنگل اور نلگنڈہ میں، نلگنڈہ کے تعلقات دیورکنڈہ، سریاپیٹ و حضورنگر میں اور ورنگل کے تعلقات پاکھال اور محبوب آباد اس سے مستثنیٰ ہیں اور مرہٹواڑی میں اضلاع اورنگ آباد کے تعلقات بھوکردن، جالنہ اور عنبر میں اور ضلع بیڑ کے تعلقات پاٹودہ اور گیورائی میں تبلیغ کی گئی۔ جاگیر کلیانی ضلع گلبرگہ، تعلقہ سدی پیٹھ ضلع میدک اور قصبہ جڑچلہ ضلع محبوب نگر میں چند روز کے لئے ایک ایک مبلغ مقرر کیا گیا تھا جو جلد موقوف کروا دیا گیا۔ ان کے سوا ہرگز ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ کسی اور مقام پر صدر مجلس تبلیغ اسلام کی طرف سے تبلیغ ہوئی۔ جہاں تک آپ کی رپورٹ شہادت دے رہی ہے اور مجھے واقعات کا علم ہے ۱۳۴۶ف میں مقامات مذکور الصدر پر کہیں کوئی فرقہ وارانہ فساد وقوع پذیر نہیں ہوا۔ ہونگلی، سعد اللہ نگر، دھارور، نرگنڈہ، اور عثمان آباد کے جن علاقوں میں رپورٹ زیر نظر سے فرقہ وارانہ فساد کا وقوع ظاہر ہو رہا ہے، ان میں سے ایک مقام بھی ایسا نہیں ہے جہاں کہیں تبلیغ کی گئی ہے۔ یہ امر انتہائی حیرت کا موجب ہے کہ عین وہ مقامات جہاں

تبلیغ ہو رہی ہے، فرقہ وارانہ کشیدگی سے محفوظ ہیں، اور جن مقامات پر فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہوئی ان کو تبلیغ سے دور کا بھی واسطہ یا تعلق نہ ہو! اور اس کے باوجود تبلیغ کو فرقہ وارانہ کشیدگی کا باعث قرار دیا جائے! ـــــ میں متوقع ہوں کہ آئندہ اس کی اصلاح فرمادی جائے گی تاکہ پبلک کو غلط فہمی نہ ہو۔ افتراپرداز کو فتنہ پردازیوں کیلئے ایک اور موقع نہ ملے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ اسیطرح مذہب اسلام کی تبلیغ نہایت باقاعدہ اور پرامن طریقوں پر حدود قانون کے اندر رہ کر کی جا رہی ہے، جس طرح مذہب عیسائیت کی تبلیغ برسوں سے جاری ہے۔ مقامی ہندو باشندوں نے کبھی اظہار رنج وغضب تو کجا، گلہ تک نہیں کیا۔ البتہ کئی مہینے بعد بعض ...... پرچارنے ان دیہاتوں میں جاکر لوگوں کو بھڑکانے کی کوشش کی لیکن تبلیغی کارکنوں کے انتہائی ضبط اور نظم نے کوئی ناگوار صورت پیدا نہ ہونے دی فقط

آپ کا مخلص

بہادر یار جنگ

جب اس قسم کی الجھنیں بھی مرحوم کو اپنے راستہ سے ہٹا نہ سکیں تو آریہ سماجیوں کی طرف سے ان کے خلاف اشتہارات چھپوائے گئے اور قصبہ قصبہ میں تقسیم کئے گئے ان اشتہاروں پر مرحوم کو ایک خونخوار شیر کی شکل میں ظاہر کیا گیا جو معصوم انسانوں کے خون پر آمادہ ہے، جب اس سے بھی کچھ بن نہ آئی تو مرحوم کے سر کے لیے ایک انعام مقرر کیا گیا، یہ سب کچھ

ہوتا رہا اور مرحوم "حسبی اللہ ونعم الوکیل" کہہ کر کام کرتے ہی رہے۔
تبلیغ کے سلسلے میں نہ صرف اغیار کی طرف سے مصیبتیں آئیں بلکہ اپنوں نے بھی کافی ستم ڈھائے، ـــــ ایک واقعہ جو مولف ہذا نے خود مرحوم کی زبانی سنا تھا لکھا جاتا ہے، اسی سے اندازہ لگائیے کہ "نواب بہادر یار جنگ" نے "عاشق رسولؐ" بننے کے لئے کیا کیا تکلیفیں اُٹھائیں ـــــ کسی قصبہ میں مرحوم نے چند اچھوتوں کو مشرف بہ اِسلام فرمایا اور وہاں کے مسلمانوں کو تاکید فرما دی کہ آئیندہ سے ان کے ساتھ بھی وہی سلوک رہے جو آپس میں ہوتا ہے، سبھوں نے وعدہ کیا اور مرحوم نے دوسرے گاؤں کی راہ لی، کچھ عرصہ بعد پھر پہلے قصبہ میں تشریف لائے تاکہ نومسلموں کی حالت معلوم کر سکیں ـــــ بہت رنج ہوا جب نومسلم شکایت کرنے لگے کہ اب بھی مسلمانوں کا برتاؤ مساویانہ نہیں ہے، جیسا کہ فرمایا گیا تھا مرحوم نے مسلمانوں کو جمع کر کے ڈانٹنا شروع کیا، اِسپر سب کہنے لگے "ہم ان نومسلموں کو برابر تو سمجھینگے مگر اپنے دسترخوان پر کھانے نہ دیں گے" اسپر مرحوم کو بہت تکلیف ہوئی، مرحوم نے ان سے کہا کہ "جب تک تم لوگ ان لوگوں کے ساتھ کھانا نہ کھا لیں گے میں ہرگز اس گاؤں سے نہ جاؤں گا اور نہ تمہارا کھانا کھاؤنگا ـــــ اسپر تمام لوگ بغیر کوئی جواب دیئے اپنے گھر چلے گئے، اور یہ فاروق اعظم کا شیدائی اپنا مختصر سا بستر لئے قریب ہی ایک درخت کے نیچے فاروقی آرام کا لطف اٹھاتا رہا ـــــ مرحوم فرماتے تھے کہ دو دن اسیطرح درخت کے نیچے گزر گئے، تیسرے روز سب مسلمان آکر معافی چاہنے لگے اور عہد کر لیا کہ آئیندہ اِن نومسلموں کے ساتھ بالکل اقربا کا سا برتاؤ رکھیں گے، مرحوم کو یقین کیسے ہو سکتا تھا، اِس کی تدبیر یہ نکالی کہ کھانا پکوایا اور ایک

دسترخوان پر ان لوگوں کو اور نومسلموں کو ساتھ ساتھ بٹھا دیا، جب دونوں فریق اپنی اپنی رکابیوں میں کھانا اور سالن لے چکے تو انھیں اچھی طرح ملانے کا حکم دیا پھر اس فریق کی رکابیاں اس فریق کے سامنے رکھدیں اور فرمایا کہ "اب کھاؤ" جب انھوں نے بلا تکلف کھا لیا تو وہاں سے چلتے بنے ——— کیا یہ ایک حیدرآبادی نواب کے احوال ہیں یا اِسلام کے ایک سچے پیرو کے کارنامے؟ ——— نہ جانے عشق کے اور ایسے کتنے ثبوت دیئے ہوں گے!!

کیا تبلیغ کا کام صرف مسلمان کر دینے سے ختم ہو جاتا ہے؟ جو کافر زمرۂ اِسلام میں آجاتا ہے، اس پر معیشت کی راہیں تنگ ہو جاتی ہیں، وہ اپنے آپ کو بے یار و مددگار پاتا ہے، اس کی حالت اِتنی مستحکم کہاں ہوتی ہے کہ ابھی سے آپ اس سے تکلیف میں صبر و شکر اور توکل کی توقع رکھیں، اس لئے ایسے نومسلموں کے لئے ایک عرصہ تک لباس و غذا فراہم کرنی پڑتی ہے یا پھر ذرایع معاش ڈھونڈنے پڑتے ہیں، ان کے تالیف قلب کے لئے ان کے بچوں کی ابتدائی تعلیم اور مدارس کا انتظام وغیرہ ایسے لوازمات ہیں جو نظر انداز نہیں کئے جا سکتے ورنہ کیا کرایا کام بگڑ جانے کا اندیشہ رہتا ہے ——— ایک آدمی کا بار کسی مبلغ پر پڑ جائے تو حقیقت کھل جاتی ہے یہاں سیکڑوں نومسلمین تھے، مرحوم نے (خدا ان کو اعلیٰ ترین مقامات سے سرفراز فرمائے) اپنی آمدنی کا بہت بڑا حصہ اس کے لئے وقف کر رکھا تھا ———

تبلیغ کے سلسلے میں، جیسا کہ اکثر مرحوم فرمایا کرتے تھے، یہ چیز بہت شدت سے محسوس کی گئی کہ غیر مسلموں کو مسلمان کرنے سے کہیں زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ خود مسلمانوں کو دیندار بنایا جائے ——— مسلمانوں کی بد دیانتی، وعدہ خلافی، زناکاری اور ان سب سے زیادہ مذہبی جہل وہ

چیزیں ہیں جن سے ان کی وقعت جاتی رہی، اگر ہر مسلم فرد اپنی اپنی جگہ سدھر جائے اور اس طرح مسلم معاشرہ ظہور پذیر ہو تو اغیار خود بخود اس کی طرف کھچنے لگیں گے۔ عوام الناس کو اتنی کہاں فرصت، اور یہ کہاں حوصلہ کہ وہ اسلامی تعلیمات کو جاننے کی کوشش کریں، ان کے سامنے تو وہ افراد ہیں جو "مسلمان" کا لیبل لگا کر کافری کے کام کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے

اس سہ سالہ تبلیغ کے بعد گو مرحوم راست تبلیغی کام نہ کر سکے لیکن مبلغین کو تنخواہیں مقرر تھیں اور ہمیشہ اس کی طرف بھی توجہ رکھتے تھے۔

حضرت محمد بہادر خاں رح کو تبلیغ کے اس سہ سالہ دور میں جو تجربے حاصل ہوئے، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے مرحوم نے اپنے خطبۂ صدارت (آل انڈیا تبلیغ اسلام کانفرنس منعقدۂ بمبئی ۱۹۳۶ء) میں بعض گرانقدر نصیحتیں تحریر فرمائی تھیں جو یہاں نقل کی جاتی ہیں:۔

"دوستو! آپ جانتے ہیں کہ اسلام نے تبلیغ مذہب میں کبھی جبر واکراہ کو جائز نہیں رکھا۔ قرآن کی زبان اس مسئلہ میں ہر قسم کے ابہام سے پاک ہے (لا اکراہ فی الدین) اور کوئی مسلمان دین کی تبلیغ میں کبھی کسی ایسے فعل کو روا نہیں رکھ سکتا جس میں کرّ، لالچ، جبر اور تشدد کو دخل ہو، اس کے باوجود آپ کو اس کا یقین رکھنا چاہیئے کہ جب آپ تبلیغ کے میدان میں قدم رکھیں گے تو جن مصیبتوں سے میں گزر چکا ہوں اور جن مصیبتوں سے بہ اتباع محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہر داعی اسلام کو گزرنا چاہیئے اور آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ عزم اور

صرف عزم، ارادہ اور صرف ارادہ کی پختگی، استقلال اور صرف استقلال، آپ کو منزل مقصود سے قریب کرسکتا ہے ورنہ اندیشہ ہے کہ آپ کے قدم ڈگمگا نہ جائیں اور آپ منزل کو پہنچنے سے قبل ہی نہ رک جائیں۔ آپ کے صاحبان ثروت کو چاہیئے کہ اس مبارک ترین کام کے لئے، جس کو میں کسی طرح نماز اور روزہ سے کم نہیں سمجھتا، اپنے دستِ کرم کو دراز کریں۔ آپ کے اصحاب علم و فکر کو چاہیئے کہ اپنی زبان و قلم کو حرکت میں لائیں، آپ کے پریس کو چاہیئے کہ اپنے اثرات سے کام لے اور آپ کے ہر فرد کو چاہیئے کہ قرن اول کے مسلمانوں کی طرح اپنے آپ کو مبلغ اسلام بنائے۔

تبلیغ کے لئے سب سے بڑی دشواری سرمایہ کی کمی ہے جو عین وقت پر دامن پکڑ لیتی ہے اور آگے بڑھنے نہیں دیتی، سرمایہ اس لئے نہیں کہ معاندین کے برخود غلط الزام کے مطابق آپ اس سے کسی کے ضمیر کو خریدیں بلکہ اس لئے کہ مبلغین کا خرچ برداشت کریں۔ قبولیت اسلام کے بعد نومسلمین کی تعلیم و تربیت کا انتظام کریں اور ان پر جو مصائب و آلام آئیں ان سے ان کی حفاظت کریں۔

تبلیغ کے لئے دوسری اہم ضرورت مخلص، سچے اور صلاحیت یافتہ مبلغین کی فراہمی ہے، ایک زمانہ تھا کہ ہم میں کا ہر شخص مبلغ ہوا کرتا تھا، لیکن آج ڈھونڈھے سے ایسے لوگ نہیں ملتے جو تبلیغ کی صحیح صلاحیت رکھتے ہوں۔

تبلیغ کی تیسری ضرورت مسلمانوں کی ہمدردیوں کا
حاصل کرنا ہے، جن کو صدیوں کی صحبت وہمسائگی نے چھوت
چھات کے اعتبار سے پورا نہیں تو آدھا ہندو ضرور بنادیا
ہے، آپ کے مبلغین کو چاہیئے کہ غیروں کو مسلمان بنانے
سے پہلے اِن مسلمانان ہند وصفت کو مسلمان بنائیں۔
اپنے تجربہ کی بنا پر میں ایک نصیحت آپ کو کرنا چاہتا ہوں
کہ دیہات میں افراد کو مسلمان بنانے کے بجائے کوشش
کیجے کہ پوری جماعت مسلمان بنے، اس وقت تک چند آمادۂ
اسلام افراد کو کلمہ پڑھانے میں دریغ کرنا مناسب ہوگا، جبتک
کہ ان کے اثر سے اس گاؤں کے اکثر اچھوت آبادی کو آمادۂ
اسلام نہ کرلیا جائے۔

یہ چند اصولی باتیں تھیں جن کی طرف آپ کی توجہ مبذول
کرائی گئی ورنہ میدان تبلیغ اِتنا وسیع ہے کہ ہر روز اس میں
نئے تجربوں کی توقع کی جاسکتی ہے۔"

---

# خاکسار تحریک

"تربیت" کے باب میں لکھا جاچکا کہ محمد بہادر خان (اعلیٰ اللہ مقامہ) کو بچپن ہی سے فنون سپاہ گری سے عشق تھا اور اسی وجہ سے مرحوم تقریباً ہر فن میں مہارت رکھتے تھے، مرحوم جتنے باتوں کے تیز تھے اس سے کہیں زیادہ عمل کے چست تھے، نسلاً سپاہی تھے اور سپاہیانہ اوصاف ہر مسلمان میں نمایاں دیکھنا چاہتے تھے، ان کی فوجی افتاد طبع اور سپاہیوں سے انس کا اندازہ اسی واقعہ سے لگایئے، مرحوم فرماتے تھے کہ ان کی سیاحت بلاد اسلامیہ میں صرف دو مقامات ایسے رہے ہیں جہاں پہنچکر وہ بے اختیار ہوگئے۔ ایک تو امام فخرالدین رازی رح کے مزار پر جب پہنچے ہیں اور یہ کتبہ پڑھا۔

"ہفتاد و دو سال درس خوندم شب و روز
معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد"

تو مرحوم پر عجیب کیفیت طاری ہوئی، لیکن دوسرا مقام تو ایسا ہے جہاں پہنچ کر وہ بے قابو ہو گئے اور غش کھا کر گر پڑے، مرحوم فرماتے تھے کہ "بڑی مشکل و تلاش سے میں حضرت خالد بن ولیدؓ کی مزار پر پہنچا، دیکھا کہ ایک ریگستانی میدان ہے جس کے قریب بعض پہاڑیاں ہیں، اسی میدان میں اسلام کا جرنیل خالد بن ولیدؓ آرام فرما ہے، جیسے ہی میرے ذہن میں ان کی معرکہ آرائیوں اور سپاہیانہ تدبر و فراست کا خیال آیا، میں غش کھا کر مزار پر گر پڑا، اور کچھ دیر تک یہی حالت طاری رہی۔"

مرحوم کی اسلامی فوجی ذہنیت اور اس سے گہرے لگاؤ کا ایک اور ثبوت ان کا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے غیر معمولی عشق تھا اکثر فرمایا کرتے تھے:۔

"کوئی کسی کا قایل ہے کوئی کسی کا قایل ہے میں تو
نظرِ عمرؓ کا گھائل ہوں۔"

ان کے "نظرِ عمر کا گھائل" ہونے کے پچاسوں ثبوت ملتے رہے، جب کبھی مرحوم کی زبان مناقب عمرؓ پر کھلتی تو تاثر کئی گنا بڑھ جاتا، حق یہ ہے کہ حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مرحوم کو سب سے زیادہ عشق حضرت عمرؓ ہی سے تھا۔

مرحوم کا خیال تھا کہ منجملہ اور کوتاہیوں اور غفلت شعاریوں کے، مسلمانوں کی سب سے زیادہ غفلت عسکریت ہی کے طرف سے ہوئی حالانکہ قوموں کی حیات میں اس کا ایک خاص حصہ ہے، مختلف تقریروں میں مرحوم نے عسکریت کی تبلیغ فرمائی، چنانچہ اپنے خطبۂ صدارت (مجلس اتحاد المسلمین) ۱۳۵۹ھ میں فرمایا:۔

"میں نے آپ سے مخاطبت کے کسی موقع کو اِس درخواست کے بغیر ختم ہونے نہیں دیا، اور آج بھی آپ کی خاص توجہ اِس طرف مبذول کرواتا ہوں کہ مسلمان کی زندگی کا نمایاں پہلو عسکریت و سپاہیت ہے۔ جس حیات مقدس ؐ کو کائناتِ ارضی کے سارے انسانوں کے لئے نمونہ بنایا گیا اس پر اگر آپ کی نظر رہے تو آپ دیکھیں گے کہ ارشاد و ہدایت کے عظیم الشان فرائض کی بجا آوری کے ساتھ ساتھ جو پہلو اس حیاتِ طیبہ میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے اور آقائے دوجہاں (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عسکریت ہے۔ ہر مسلمان اعلائے کلمۃ الحق کے لئے خدا کی فوج کا ایک سپاہی ہے، اور اگر عہد حاضر کے مسلمان سپاہیت کی طرف سے غفلت برت رہے ہیں تو یقیناً وہ اپنے رسول ؐ کی پیروی سے غفلت برت رہے ہیں ——— آقائے دوجہاں (صلی اللہ علیہ وسلم) کا متروکہ نہ درہم تھے نہ دینار نہ لونڈیاں تھیں نہ غلام، نہ املاک تھے نہ تجارت، لیکن اُمہات المومنین کے تنگ حجرے اگر آپ کے کسی اثاثہ اور متروکہ سے بھرے ہوئے تھے تو وہ آپ کی ؐ تلواریں، آپ ؐ کی زرہیں، آپ ؐ خود، اور آپ ؐ کی کمانیں تھیں ——— میں مسلمانوں کو اسوۂ حسنہ کے اس پہلو کی طرف بطورِ خاص متوجہ کرتا ہوں، میں ان کے ہر ایک فرزند کو خالد ؓ و ابوعبیدہ ؓ کا غلام دیکھنا چاہتا ہوں" ——— (سیاسی تقاریر ایضاً)

لیکن موجودہ تعلیم یافتہ نوجوانوں سے زیادہ اور کوئی ہے جو اس اہم فریضہ سے کنارہ کش، اور اس مردانہ وصف سے عاری ہے؟ مرحوم نے بارہا اس کے شکوے سنائے۔

" خون کے آنسو رلاتی ہے وہ نزاکت ونسوانیت جو ہمارے نوجوانوں میں دن بدن بڑھتی جارہی ہے، میں خداوندانِ مکتب" کو آگاہ کردینا چاہتا ہوں کہ ان " شاہین بچوں" کو" خاکبازی کا درس" دینا ملت کے لئے قبر تیار کرنے کے مترادف ہے۔ جامعہ عثمانیہ ہماری امیدوں کا مرکز ہے، ہماری نگاہیں اس تعلیم گاہ سے فارغ ہونیوالوں کے مستقبل پر لگی ہوئی ہیں۔ لیکن میں کبھی کبھی سوچنے لگتا ہوں کہ اس عشرت انگیز اور امیرانہ ماحول سے نکل کر جو دن بدن لم یخلق مثلھا فی البلاد کی شان حاصل کرتا جارہا ہے، ایک نوجوان معاشی زندگی کے مصائب کو کیونکر برداشت کرسکے گا۔ اور اگر ضرورت پڑے تو ملک و ملت کے لئے بخون و خاک غلطیدن کی رسم کس طرح ادا کرسکے گا۔ اقبال علیہ الرحمۃ کی زبان میں مجھے کہنے دیجئے ؎

" من آن علم و فراست با پرکاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را "

غرض عسکریت کی بڑی اہمیت محسوس کرتے تھے، اور جس طرح ان کے کردار کی خصوصیت تھی کہ کوئی بات اس وقت تک نہ کہتے جب تک کہ خود اس پر عمل پیرا نہ ہوتے یا کم از کم کہہ چکنے پر عمل میں سب سے پیش پیش نہ رہتے،

یہی وصف یہاں بھی نمایاں نظر آئے گا۔ بچپن کی سپاہیانہ مشقیں کیا محض شغلہ (Hobby) کے لئے تھیں؟ ہرگز نہیں، ایک معین مقصد کے تحت سب کچھ کیا جا رہا تھا، ورنہ جاگیردار ہوتے ہوئے بھی کوئی عسکریت کو اپنا مشغلہ بناتا ہے؟ اور کیا عسکریت کے معنی صرف گھوڑے کی سواری کرنے، تیغ و تفنگ چلانے اور تیرنے ہی کے ہیں؟ کیا بھوک کی تکلیف اٹھانا، دولت وعیش کو ٹھکرانا، عزت کو خیرباد کہنا، جان کو خدا حافظ کہنا یہ سب اس سے خارج ہیں؟ ایک سپاہی یا پاہی سے واقف شخص ہی سے پوچھا چاہیئے۔

**خاکسار تحریک**

تبلیغ کے عصا نے آریہ سماجیوں اور شدھی سنگھنوں کے مذہبی سانپوں کو تو ہضم کر لیا، لیکن کیا حقیقتاً ان کا منشا (خصوصاً آریوں کا) اپنے دھرم کی اشاعت ہی تھا؟ سب جانتے ہیں کہ مذہب کی آڑ لیکر ایک فوج تیار کی جا رہی تھی، تاکہ مسلمانوں کے رہے سہے، چھوٹے موٹے قلعے بھی فتح کر لئے جا سکیں ـــــ مسلمانوں پر غفلت کا بخار کچھ ایسا چڑھا ہوا تھا کہ انھیں نہ اپنے کھوئے ہوئے کی تلخی محسوس ہوتی تھی، نہ دشمنوں کی تیاری دیکھکر آئندہ کی درشتی کا احساس ہوتا تھا اُدھر دنگل اور اکھاڑے قایم ہو رہے تھے، ویدوں کی بے روح تعلیم سے بچا کر عسکریت کے درس دیئے جا رہے تھے اور ادھر سب کچھ ہونے پر بھی بے اعتنائی اور غفلت شعاری کا وہی عالم تھا ـــــ

مرحوم نے محسوس کیا کہ اگر اس وقت مسلمانوں کو مسلح نہ کیا گیا تو ممکن ہے ان بدخواہوں کو اپنے مقاصد میں فتح ہو جائے، اسی زمانے میں عنایت اللہ خاں مشرقی کی تحریک شروع ہوئی۔ مرحوم نے اسے بڑی امید بھری نظروں سے دیکھا، خود وابستہ ہو گئے، ضلع ضلع اور گاؤں گاؤں

پھر کر اس کی اشاعت کی، گوشہ گوشہ میں یہ آواز پہنچائی :-

"دوستو! دنیا کے نہ کسی فرد نے تکلیف کے بغیر آرام و راحت کی صورت دیکھی ہے نہ کسی قوم نے، جس کو تلاش راحت ہے اس کو پہلے مبتلائے مصیبت ہونا چاہیئے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں۔ فمن طلب العلیٰ سہر اللیالی اور ہمارا عہد حاضر کا شاعر کہتا ہے :-

میں تم کو بتاتا ہوں تقدیر اُمم کیا ہے
شمشیر و سنان اول طاؤس و رباب آخر

جن قوموں نے اس راز حیات اور سِرِ زندگی کو پہچانا، انکی رفعت و مرتبت کا پہچاننا دنیا والوں کے لئے مشکل ہو گیا، لیکن جن امتوں نے عالم ذلت و رسوائی میں بھی شمشیر و سنان سے بیگانہ ہو کر چنگ و رباب سے دوستی کی وہ دنیا میں کسی کے لئے قابل رشک نہیں رہیں، کیا تم کو ان دنوں کے یاد دلانے کی ضرورت ہے جبکہ دوجہاں کے سردار اور صاحب لولاک خاتم النبین اور رحمۃ اللعالمین (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی راتیں گھوڑوں کی ننگی پیٹھوں پر بسر کرتے تھے اور راتوں کو جاگتے جاگتے آپ کے قدوم مبارک متورم ہو جایا کرتے تھے؟ کیا تم نے تاریخ کے ان ایام پر نظر نہیں ڈالی جبکہ فاروق اعظم رضؓ میدان جنگ سے آنے والے نامہ بر کی تلاش میں مدینہ سے میلوں دور

نکل جایا کرتے تھے؟ کیا تم نے ان دنوں کو بھلا دیا جبکہ
دنیا سے چھوٹے بڑے، امیر و غریب اور عرب و عجم کا
فرق مٹانے والا، کفر و ایمان کے درمیان ایک خندق
کے ذریعہ حدِ فاصل کھینچ رہا تھا اور اس کے شکم اطہر پر
پتھر بندھے ہوئے تھے؟ اگر یہ سب تم کو یاد ہے تو پھر مجھے
تمہاری اس زحمت پر اظہار تاسف و ہمدردی کی ضرورت
نہیں جو تم نے برسوں یہاں برداشت کی ہے، زحمت
ناآشنائی اور محنت ناشناسی ہی تو ہماری اس نکبت و
ذلت کی ذمہ دار ہے، جس کو محسوس کر کے پھر ایک مرتبہ
ہم آمادۂ عمل نظر آتے ہیں۔ خدا ہمارے ارادوں میں برکت
اور ہمتوں میں بلندی عطا کرے۔" (سیاسی تقاریر)

مرحوم نے اس تحریک میں رہ کر رضاکارانہ حیثیت سے وہ وہ کام کئے اور بے نفسی اور اسلام دوستی کے ایسے ایسے ثبوت دیئے جو ایک امیرزادہ اور عیش پروردہ سے تو کیا، عام مذہب پرستی کے دعویداروں سے بھی ممکن نہیں، خاکی وردی پہنے ننگے پیر شاہ راہ عام پر، امیر کے حکم کی اتباع کرنا بلا نفس کو کچلے ہو بھی سکتا ہے؟ نماز میں تساہل پر کوڑوں اور دروں کی برداشت بغیر عاقبت کے اجر پر نظر رکھے اور اس دنیا کو ہیچ سمجھے ممکن بھی ہے؟

گلبرگہ کا واقعہ ہے، حضرت خواجہ گیسو دراز رح کے عرس کی وجہ سے لاکھوں کا اجتماع ہے، خاکساروں نے اپنا ایک کیمپ قایم کر رکھا ہے، لوگوں کی خدمت میں مصروف ہیں، اپنی فوجی حیثیت سے لوگوں کو متاثر کر رہے ہیں۔ ایک دن پریڈ میں مرحوم چند منٹ دیر سے پہنچے، سالار نے

حکم دیا کہ سزاءً (ایک خاص فاصلہ کے) بیس چکر لگائیں، ہزاروں کا مجمع انگشت بدنداں دیکھ رہا تھا کہ یہ جاگیردار بیلچہ کندھے پر رکھے اطاعت امیر کا عملی درس دے رہا ہے اور بلا پس و پیش دوڑیں لگا رہا ہے۔

ایسے ہی اور کئی واقعات عوام نے دیکھے، مرحوم کے خلوص و عمل نے ان کے دلوں میں گھر کرنا شروع کیا، اور لوگ اس تحریک کی طرف عملاً بڑھنے لگے، دیکھتے ہی دیکھتے اضلاع اور تعلقوں میں اس کی شاخیں قائم ہو گئیں اور ایک مضبوط محاذ قائم ہو گیا، اور مرحوم کے قیاس کے مطابق آریا سماجیوں کے حوصلے پست ہونے لگے اور وہ سہم گئے۔

مشرقی صاحب نے جس وقت تحریک کا آغاز کیا تھا، اس وقت ان کی دیانت، نیک نیتی اور خلوص میں شبہ نہ کیا جا سکتا تھا اور واقعی شبہ تھا بھی نہیں، خود مرحوم نے اس دور کی تقریروں میں ان کے مقاصد وعزائم کی بنا پر ان کو کافی سراہا، مثلاً خاکساروں کی ایک تقریر میں مشرقی کی یوں تائید فرمائی:-

> دوستو! تاریخ عالم کا یہ کھلا ہوا واقعہ ہے کہ دنیا میں جب کبھی کوئی مخلص انسان خدا سے ٹوٹی ہوئی اور ذلت نصیب قوم کو بلندیٔ اخلاق کا سبق دیکر عزت و شوکت کے بام عروج پر پہنچانے کا عزم صمیم لے کر نمودار ہوا تو خود غرض افراد قوم نے اس مخلص انسان میں کسی ذاتی عیب کو نہ پا کر ہمیشہ معتقدات ہی کے کمزور ہتیار سے وار کیا، آج بھی اس مخلص انسان عنایت اللہ خاں مشرقی کے ساتھ یہی کیا جا رہا ہے۔ ______

عنایت اللہ خاں مشرقی نے امیرانہ زندگی پر لات مار کر صرف تین جوڑے معمولی کپڑوں پر زندگی بسر کرنے کا ایسا ریکارڈ قایم کیا ہے کہ ہندوستان میں ایک شخص ایسے مستقل ارادے کا نہیں ہے ........ اختلاف عقاید کا سوال پیدا کرنا محض بے معنی اور لغو ہے، ہمارا ایمان ہے کہ اللہ کا کلام ہمیشہ محفوظ رہنے والا ہے اور عنایت اللہ خاں مشرقی آج نہیں تو کل مرنے والے ہیں مسلمان کا تعلق تو کسی مرنے والے سے نہیں بلکہ زندہ رہنے والے سے ہوتا ہے"۔

(سیاسی تقاریر)

اِنہی خیالات کے تحت مرحوم ایک عرصہ تک خاکسار کی حیثیت سے خدمت خلق میں مصروف رہے، اس وقت بھی جبکہ اتحاد المسلمین میں شرکت فرما چکے تھے اور سرگرمی سے اس کی ترقی میں کوشاں تھے، اِس تحریک سے تعلق نہ توڑا، مرحوم چاہتے تھے کہ یہ جماعت اتحاد المسلمین کے تحت رہ کر اس کی عسکری ضرورتوں کو پورا کرتی رہے، لیکن بعض ناعاقبت اندیش خاکساروں نے اس کی مخالفت کی۔ــــ حیدرآباد کے خاص حالات کے تحت مرحوم کا پہلے ہی سے خیال تھا کہ تحریک خاکسار کے اصول میں تھوڑی سی تبدیلی کی جائے لیکن اس میں مرحوم کو کامیابی نہیں ہوئی، اس کی ایک وجہ تو مشرقی صاحب کا یہاں کے حالات کو نظرانداز کر کے اس کی اجازت نہ دینا تھی اور دوسری وجہ ان حاسدوں کی غلط اطلاعیں تھیں جو مرحوم کے رسوخ کو دیکھ کر ان کے خلاف

مشرقی صاحب کے پاس پہنچائی جاتی رہیں، اس واقعہ کا اظہار خود مرحوم نے اپنی ایک تقریر میں جو خاکساروں ہی کے جلسے میں ہوئی تھی! اس طرح فرمایا:—

"چند روز پیشتر مجھ میں اور علامہ مشرقی میں کچھ خفیف سا اختلاف ہو گیا تھا اور وہ محض اس بنا پر تھا کہ علامہ صاحب نے ہمارے ملک کے مقامی حالات سے ناواقف رہکر انجمن اتحاد المسلمین کے معاملہ میں دخل دیا تھا، میں انھیں اب بھی غلطی پر سمجھتا ہوں لیکن اس کی ذمہ داری بھی ان پر نہیں بلکہ یہیں کے بعض افراد پر ہے۔"

(سیاسی تقاریر)

اس بجا اختلاف کے باوجود مرحوم اس تحریک کی افادیت کے مدنظر اس سے ملحق رہے اور اندرون مملکت اور بیرون مملکت اسکی بڑی بڑی خدمات انجام دیں، جس کا اعتراف خود قاید تحریک کو بھی تھا چنانچہ اسی بنا پر آخر زمانہ میں سرحد کے سالار بھی مقرر ہوئے تھے۔

مرحوم نے جس طرح یہاں اس تحریک کو مجلس اتحاد المسلمین کے تحت لانے کی کوشش کی، اسی طرح ہندوستان کے لئے بھی یہی مناسب تصور فرمایا کہ یہ مسلم لیگ کے تحت کام کرے، مرحوم کو اندیشہ تھا کہ دو الگ الگ مستقل جماعتیں ہونے کی صورت میں ممکن ہے کہ کسی مسئلہ میں آپس میں اختلاف ہو جائے اور اس طرح مسلمانوں کی وحدت جاتی رہے۔ یہ چیز بالکل صحیح نکلی اور سب نے دیکھا کہ کتنے

معاملات میں مشرقی صاحب نے مصلحت کو نہ سمجھ کر یا محض ضد اور اپنی بڑائی جتانے کے لئے مسلم لیگ اور اس کے صدر کی مخالفت کی، مرحوم کے لئے یہ بات ناقابل برداشت تھی۔ جب انتہائی سمجھانے بجھانے کے باوجود مشرقی صاحب کو " قطب از جا نمی جنبد " کا مصداق پایا تو خود ہی اِس جماعت سے الگ ہو گئے اور پھر جو تحریک کی حالت ہو گئی وہ محتاج بیان نہیں۔

مشرقی صاحب کی شدت پسندی اور غلط پالیسی روز بروز بڑھتی گئی، جس کا انتہائی براثبوت " پاکستان " کی مخالفت، گاندھی جی سے ربط جوڑنے کی کوشش اور قاید اعظم پر قاتلانہ حملہ کی شکل میں ظاہر ہوا۔ مرحوم نے اب مشرقی صاحب کی پورے زور سے مخالفت فرمائی، چنانچہ حادثہ کشمیر کے بعد جو طویل بیان دیا اس میں اس بات کی وضاحت فرمائی کہ اب مشرقی صاحب میں قیادت کی صلاحیت باقی نہیں رہی اور وہ خواہ مخواہ اپنی برتری اور ضد کی خاطر مفاد قومی کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اگست ۱۹۴۲ء کے مدینہ کے صفحات اس کے شاہد ہیں۔

## جماعت رضاکاران

جب خاکساروں کی بنی بنائی منظم جماعت اس طرح مجلس سے کٹ گئی تو مرحوم نے اس کی تلافی جماعت رضاکاران سے کی۔ مجلس اتحاد المسلمین کے تحت ہر ضلع تعلقہ اور قصبہ میں ورزش جسمانی اور تھوڑی بہت عسکری تعلیم کے مراکز قایم کئے گئے۔ اور نوجوانوں کی تربیت کے اِنتظامات عمل میں آئے، اس طرح ایک

ایک حد تک تلافی ہو گئی، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ جماعت خاکسار جماعت کا بدل ثابت نہ ہو سکی اور اس کی وجہ کام کرنے والوں کی کوتاہی کے سوا اور کچھ نہیں ——

---

# مجلسِ اتحادُ المسلمین

محمد بہادر خاں (نور اللہ مرقدہٗ) نے حیدرآبادی مسلمانوں کی جن مختلف حیثیتوں سے خدمات انجام دیں، ان کی اہمیت وعظمت کا اندازہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ یہاں کی معاشی وسیاسی اجتماعی کیفیت کا ایک سرسری مطالعہ کیا جائے ــــــــ

حکومت آصفیہ ہے کیا؟ وہی مغلیہ حکومت کے شعلہ کا ٹوٹا ہوا ایک شرارہ، جس کو آصفجاہ اول رح نے نہ معلوم کتنے جتن سے اور کیسی کیسی امیدوں کے ساتھ شمالی حوادث سے بچاکر دکن میں فروزاں کرنے کی کوشش فرمائی تھی، لیکن کہاں تک ان کی تمنائیں پوری ہوئیں اس کا جواب تاریخ سے اور اپنی فہم سے حاصل کرنا چاہیئے ــــــ البتہ یہ بات واضح ہے کہ ادھر اورنگ زیب کو اور یہاں حضرت آصفجاہ اول کو ہٹاکر دیکھئے تو ایک ہی

رنگ اور ایک ہی نقشہ نظر آتا ہے۔ تخت شاہی کی نظروں میں ہر مذہب و ملت کی یکساں حیثیت (بلکہ غیر مذہب اور قوم کا زیادہ لحاظ) وہاں بھی اور یہاں بھی، مذہب کی محض انفرادی حیثیت وہاں کے بادشاہوں کا بھی شعار اور یہاں کے حکمرانوں کا بھی مسلک ——— پھر نتائج کیوں نہ یکساں ہوں! مسلمانوں کی چھ سو سالہ حکمرانی کے باوجود، دیکھ لیجئے کہ دکن میں سارے معاشی ذرائع کس کے قبضہ میں ہیں؟ ملک کی ۸۵ فی صد دیہی آبادی پر عاملانہ اقتداراً تمام ترکن کو حاصل ہے؟ معاش اور جائدادوں کی صورت میں حکومت کے رحم کا پلہ کن کی طرف جھکتا ہوا ہے؟ وہی ہندوؤں کی طرف، پھر اگر برسوں ہندوؤں کی گردنیں احسان مندی سے جھکی رہیں تو کونسی تعجب کی بات ہے؟ لیکن حکومت کو اگر احسان کی "عادت" ہی ہو گئی ہے تو کیا یہ بھی "تسلیم کی خو" کو ہمیشہ ہی اپنا شعار بنائے رکھیں گے؟ ——— جہاں دیدہ سعدیؒ نے سچ کہا ہے کہ کھاری زمین، ہزار ترکیبوں کے باوجود، سنبل نہیں اگا سکتی

زمینِ شورہ سنبل بر نیارد — درو تخمِ عمل ضائع مگردان
نکوئی با بدان کردن چنان است — کہ بد کردن بجائے نیک مردان

یہی ہوا ۱۹۲۴ء کے بعد شدھی سنگٹھن اور آریا سماجی اکثریت کی سرور آفریں شراب لئے حیدرآباد آئے، صوبوں اور ضلعوں میں پھیلے حویلیوں اور جھونپڑوں میں گھسے، ایک ایک کو اپنے تحفہ سے سرشار کیا۔ مذہبی تبلیغ کے جام میں سیاسی اقتدار کی شراب خوب پلائی، بدمستی میں حکومت آصفیہ کے سارے کئے کرائے احسانات فراموش ہو گئے ——— پٹابھی سیتارامیا کی "تاریخ کانگریس" خود اس بات کی شاہد ہے کہ ان تحریکوں کا مقصد بجز حصول اقتدار کے اور کچھ نہیں۔ پھر یہ بات چھپی کب رہی، بہت سے

سانپوں نے علانیہ زہر اگلنا شروع کیا۔ ایک آریا سماجی بلدیو نے ۲۹ مارچ ۱۹۳۸ء میں کتنا زہر اگلا ہے:۔

"ہندوستان سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹ جانا چاہیئے، ہم عنقریب مسلمانوں کو قتل کر دینے والے ہیں، ہندوستان میں نظام کی ریاست کا وجود نہیں رہنا چاہیئے (اس راج کے اندر) کوئی مسلمان بادشاہ نہیں رہ سکتا۔ ہمیں چندہ جمع کرنا چاہیئے، آپس میں متحد ہو جانا چاہیئے اور مسلمانوں کے خلاف پروپگنڈہ کرنا چاہیئے۔ ہمارا فرض ہے کہ چھ ماہ کے اندر نظام کے تخت پر قبضہ کرلیں"

(صفحہ ۶ رسالہ آریا سماج)

اغیار کا یہ عالم، اور اپنوں کی یہ کیفیت تھی کہ شیعہ کو سنی سے عناد، وہابی کو غیر وہابی سے بغض، صوفی کو (مراد اصطلاحی) غیر صوفی سے بیر، عالم و جاہل کے اتفاق میں ایک خلیج حائل ——— ہر شخص اپنی اپنی جگہ مست، اپنے اپنے ظن باطل میں گم، نہ معاش کی خبر نہ سیاست کی فکر، گھر میں چور گھس چکے لیکن گھر والے بے خبر، فوجیں قلعہ میں داخل ہو چکیں اور تانا شاہ کے چیلوں کو انفرادی لذتوں سے فرصت ہی نہیں، جمعیت دھاوا بول رہی ہے اور یہ "اجتماعیت" کے معنی سے بے خبر!! ———

بعضوں کو فکر ہوئی، مولوی محمود نواز خاں قلعہ دار، حکیم مقصود علیخاں مولوی بندہ حسن وغیرہ نے اس سیلاب کے تدارک کے لئے ایک مجلس کی تشکیل دی ——— اس کے مقاصد یہ قرار پائے:۔

۱۔ تمام اسلامی فرقوں کو تحفظ اسلام کی غرض سے اصول اسلام کے

اِسلام کے تحت متحد کرنا۔

۳۔ مسلمانوں کے اِقتصادی، معاشرتی اور تعلیمی مقاصد کا تحفظ کرنا۔

۴۔ ملک و مالک کی وفاداری اور قانون مروجہ کا اِحترام۔

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ مجلس اتحادالمسلمین" شایع کردہ دارالاشاعت سیاسیہ حیدرآباد۔)

اس طرح "مجلس اِتحادالمسلمین" کا ظہور رہوا، لیکن ضرورت تھی کہ خاموش کام کو جلد از جلد اس طرح پیش کیا جائے کہ ایک طرف عامۃ المسلمین کا اِعتماد حاصل ہو اور دوسری طرف حکومت پر ساکھ قایم ہو جائے۔

**مجلس میں نئی روح**

محمد بہادر خاں رح نے محسوس کیا کہ خاکسار تحریک محدود ہے اور اگر اس وقت دائرۂ عمل وسیع نہ کیا گیا تو بڑی ناعاقبت اندیشی ہوگی، خاکسار تحریک کی طرف سے توجہ کم کردی اور مجلس کے اِستحکام میں پوری سرگرمی سے حصہ لینا شروع کیا، قائد ملت رح کا مجلس کی آبیاری کرنا تھا کہ یہ نخل بڑھا، پھیلا اور خوب پھیلا، یہاں تک کہ ساری ریاست کے مسلمان اس کے سایہ میں عافیت کی سانس لینے لگے، دماغوں میں تراوٹ آئی، برے بھلے کا خیال آیا، اپنے مقام کا احساس پیدا ہوا، بڑے بننے کی تمنا، ہوئی —— آن کی آن میں جس مجلس کو کوئی نہ جانتا تھا، ہر ایک پہچاننے لگا، اغیار کے حوصلے پست ہونے لگے اور حکومت پر واضح ہو گیا کہ اب یہ ایک مستقل قوت ہو چکی ہے —— مجلس کی گمنامی اور محمد بہادر خاں کی شرکت کے ساتھ یکا یک شہرت کا اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اکثر لوگ بلکہ خود خسرو دکن نے بھی ان کو "بانئی اتحادالمسلمین" سے مخاطب کیا،

اور معنوی اعتبار سے یہ غلط بھی نہیں۔

مرحوم نے تبلیغ کا کام، خاکسار تحریک کی شرکت اور مجلس اتحادالمسلمین کا احیاء، یونہی نہیں فرمایا تھا بلکہ خوب غور کرکے بعد یہ تین محاذ قایم کئے تھے تاکہ مذہبی، عسکری اور سیاسی پہلو سے دشمنوں کو شکست دی جاسکے اور اقتدار کو نقصان سے بچایا جاسکے، چنانچہ اگست ۱۹۴۰ء میں خاکسار کیمپ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

مسلمانو! آپ جانتے ہیں کہ اگر ہرن پر گولی چلائی جائے اور ہرن چھلانگ مارتا ہوا نکل جائے تو کوئی نہیں کہے گا کہ نشانہ صحیح بیٹھا، پس صاف دیکھ لو کہ میں نے دو گولیاں چلائی تھیں، ایک تبلیغ کی اور دوسری خاکسار تحریک کی، اِن دو گولیوں نے ہمارے دشمن کو اس بُری طرح تڑپایا کہ ہر بات میں چیخ چیخ کر انہی گولیوں کو ستاتا ہے۔ جب دشمن کو ان گولیوں سے تڑپتا ہوا دیکھتے ہو تو پھر اس عمل سے تمہاری علیحدگی میری سمجھ سے باہر ہے۔ یہ صحیح گولیاں ہیں، تمہیں بھی اس کا استعمال ضروری ہے تاکہ وہ اور زیادہ تڑپے یا ہمارا ساتھی ہوجائے۔ اب میں نے تیسری گولی اتحادالمسلمین کی چلائی ہے یہ آخری اور زیادہ موثر گولی ہے جو اس کو موت کے گھاٹ اتار رہی ہے اب اس میں کوئی دم نہیں رہا ہے کہ ہمارے مقابلہ پر آئے ـــــ مگر ہاں میں تمہیں صاف بتلا دینا چاہتا ہوں کہ ہر ہندو ہمارا دشمن نہیں ہے، بہت بڑی اکثریت

ہماری دوستی پر فخر کرتی ہے، صرف چند اشرار ہیں اور
سب بیرونی اثرات ہیں۔ اب انشاء اللہ ان سب کا
خاتمہ ہو جائے گا۔"
(سیاسی تقاریر بہادر یار جنگ شایع کردہ دارالاشاعت سیاسیہ حیدرآباد)

**مسئلۂ اقتدارِ اعلیٰ** گو کانگریس ہمیشہ دعویٰ کرتی رہی ہے کہ ریاستی معاملات اس کے دائرہ عمل سے خارج ہیں لیکن جیسے اور چیزوں میں کانگریس کی مکاری مسلّم ہے، یہاں بھی اسی عیاری سے کام لیا گیا۔ دستور ۱۹۳۵ء کے نفاذ سے کانگریس کو قوت حاصل ہوئی اور اس نے ریاستوں کے خلاف مہم شروع کر دی، سب سے پہلے ریاستی نظم ونسق پر حملے شروع ہوئے۔ اس کے بعد اسٹیٹ کانگریس جلوہ گر ہوئی ـــ

حیدرآباد میں سر اکبر حیدری قلمدان وزارت سنبھالے ہوئے تھے جن کی حکمت عملی کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے، بہرحال ان کی بعض تقریروں کی وجہ سے ظاہر ہونے لگا کہ حکومت نے اس آئین حکمرانی کو جو اس سلطنت میں صدیوں سے جاری ہے، بدلنے کا ارادہ کر لیا ہے، ـــ اب کیا تھا کانگریسیوں کی ہمتیں بندھ گئیں، کانگریس اور ہندو مہا سبھا نے اپنی تمام تر توجہات اس ریاست کی طرف مبذول کر دیں، حیدرآباد کے ہندو زعما بار بار وار دھا کا طواف کرنے لگے، گاندھی اور ڈاکٹر امبیڈکر کے چیلوں کی درآمد شروع ہو گئی، مہا سبائیوں نے فاش طور پر اور کانگریسیوں نے "قومیت" کے پردے میں "ذمہ دارانہ حکومت" کے مطالبے شروع کئے، فرقہ واریت پیدا کر دی اور اندرون و بیرون ریاست دولت آصفیہ کے خلاف زہر اگلنا شروع کیا ـــ ۱۳۴۸ف سے

باضابطہ ستیاگرہ کا آغاز ہوا، قتل وخون کا بازار گرم ہوا، سلطنت کے مختلف گوشوں سے بیگناہ مسلمانوں کے قتل کی خبریں آنے لگیں ——

ایسے پر آشوب اور نازک دور میں قاید ملت محمد بہادر خاں ؒ نے مجلس کی جو صحیح رہنمائی فرمائی اور جس تدبر و جرأت سے کام لیا ایک ناقابل انکار واقعہ ہے، ایک طرف عوام کو خواب غفلت سے چونکایا، دوسری طرف جاگیرداروں کو جھنجوڑا، اور ایک ایسی مضبوط دیوار اٹھائی کہ باطل کی موجیں ٹکرا کر پاش پاش ہوگئیں —— علامہ سید سلیمان ندوی نے اس کا بہت صحیح نقشہ کھینچا ہے:-

"حیدرآباد میں اگر ان پچھلے چند برسوں کے اندر جب سر حیدری کی سیاست حیدرآباد کے دستور کی ترکیب و تحلیل میں مصروف تھی، نواب بہادر یار جنگ کا وجود نہ ہوتا، تو حیدرآباد کے نظم ونسق کا کچھ اور ہی اندازہ ہوگیا ہوتا، بیرونی ہندو لیڈروں اور دکن کے مرہٹوں نے ریاست کی امن دوست اور وفادار غیر مسلم رعایا کو بھڑکانے میں کوئی کمی نہیں کی، اور یہ دعویٰ کیا کہ مردم شماری کے مطابق ریاست میں دونوں قوموں کے حقوق مانے جائیں، یہ سب کچھ ہوتا رہا مگر اس ملک کے مسلمان بالکل خواب غفلت میں اور بجز عیش، آرام ان کا کوئی دوسرا مشغلہ نہ تھا، وہاں کے مسلمان جاگیردار جو اس ملک کی بڑی قوت ہیں، محو استراحت تھے، دکن کے مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ صدیوں سے حکومت کے سر پر سارا بوجھ رکھ کر آرام طلبی اور بے فکری کے عادی ہوگئے ہیں، اس بیکاری سے ان کے دست و بازو شل اور قوائے عمل معطل ہیں، ان کا کوئی قومی تخیل اور سیاسی جذبہ زندہ نہیں رہا ہے اور کسی حال میں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ ان کشورستانوں کی یادگار رہیں، جنھوں نے اپنے کو بڑی مشکلوں میں ڈال کر دکن کی آصفی حکومت کو قایم کیا تھا ——

مرحوم کا بڑا کارنامہ اسی جذبہ کو زندہ کرنا تھا، انھوں نے جاگیرداروں کو جھنجوڑ کر جگایا، اور بتایا کہ اگر انھوں نے اُٹھ کر اپنی زندگی اور ملک کو اپنی ضرورت کا یقین نہیں دلایا، تو زمانہ کا سیلاب ان کے اقتدار کو بہالے جائے گا، عام مسلمانوں کو یہ یاد دلایا کہ یہ ملک تمہارا مفتوحہ اور مقبوضہ ملک ہے اور تم بحیثیت قوم کے اس کے کشورکشا اور فاتح ہو، اور خانوادۂ آصفی کا سرتاج تمہاری حکومت کا نمائندہ، تمہاری طاقت کا مظہر، تمہاری بادشاہی کا ستون اور تمہاری وفاداری کا مرکز ہے۔" ——— ("معارف" اگست ۱۹۴۴ء)

غرض جب کانگریس کی طرف سے مسلمانوں کے اقتدار کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی تو مرحوم نے یہ سیاسی کلمہ ہر ہر مسلمان سے پڑھوایا کہ:۔

"ہم دکن کے بادشاہ ہیں، اعلیٰحضرت کا تخت و تاج ہمارے سیاسی اور تمدنی اقتدار کا مظہر ہے، اعلیٰحضرت ہماری بادشاہت کی روح ہیں اور ہم ان کی بادشاہت کا جسم، اگر وہ نہیں تو ہم نہیں اور ہم نہیں تو وہ نہیں۔"
(سیاسی تقاریر)

یہ کوئی نیا سبق نہ تھا، مرحوم نے بھولے ہوئے درس کا اعادہ کرایا، لیکن اگر اس نازک موقع پر یہ یاد دہانی نہ ہوتی تو آج ذمہ دارانہ حکومت کا سحر چل گیا ہوتا۔ مرحوم کا یہ کوئی معمولی احسان نہیں۔

**ملوکیت کی تائید**

حیدرآباد میں مسلمانوں کی اقلیت اور ہندوؤں کی اکثریت ناقابل انکار حقیقت ہے، ساتھ ہی مسلمانوں کی غفلت اور ان کی معاشی، سیاسی اور تعلیمی زبوں حالی بھی روشن ہے، ایسی حالت میں یہ کوشش کرنا کہ یہاں انتخاب کے ذریعہ مسلمانوں کا فرمانروا مقرر ہو،

ایک قبل از وقت اِقدام ہوگا۔ مرحوم اِس بات پر سختی سے مصر تھے کہ حیدر آباد کے موجودہ حالات کا لحاظ کرتے "ملوکیت" ہی صحیح ترین طرزِ حکومت ہوسکتی ہے، اِسی ملوکیت کے تحت قوانین اِسلامی کا نفاذ عمل میں آسکتا ہے، اپنے اس خیال کی تائید میں مرحوم، علامہ جمال الدین افغانی کو پیش فرماتے تھے؛۔ ایک مرتبہ 'جمال الدین افغانی' پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"جمہوریت کا وہ شیدائی اور عمومیت کا وہ فدائی جو قاچار کو قتل کرنے خدیو اسمٰعیل کو ختم کرنے کے منصوبے گانٹھ رہا ہو اور جس کو دنیا آج بھی شہنشاہیت اور ملوکیت کا دشمن تصور کرتی ہو، حیدر آباد آتا ہے اور دو سال حیدر آباد میں رہتا ہے، اس وقت کیا حیدر آباد اپنی موجودہ حالت میں نہ تھا؟ کیا بلارم والوں کی چھاؤنیاں اس وقت انگریزی فوجوں سے خالی تھیں؟ کیا اس وقت حیدر آباد میں انگریزی ریذیڈنسی قائم نہ ہوئی تھی؟ اور کیا حیدر آباد میں اس وقت ایک با اِقتدار ملوکیت کام نہیں کر رہی تھی؟ پھر کیا وجہ ہے کہ شہنشاہیت کا دشمن، ملوکیت کا قاتل جمال الدین دو سال حیدر آباد میں رہتا ہے اور اس ملوکیت کے خلاف ایک لفظ نہیں کہتا ــــ اِس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ جمہوریت یہاں کیا حیثیت اِختیار کرے گی اور کس جانب منتقل ہوگی؟" ـــــــ (سیاسی تقاریر)

یہ ایک حقیقت ہے کہ جہاں ترکی، ایران اور افغانستان اور مصر میں ملوکیت کی تباہی اِسلامی جمہوریت کے احیاء کا باعث ہوگئی حیدر آباد میں یہی چیز مسلمانوں کی غلامی اور اِسلام کی بیخ کنی کے نتائج پیدا کرے گی۔ اِسی لیے مرحوم فرماتے تھے:۔

"حیدر آباد کی ہر دستوری تبدیلی میں مسلمانوں کے لئے دو(۲) امور سب سے زیادہ

قابل لحاظ ہیں، ایک یہ کہ اقتدارات اور وزرا کی ذمہ داریاں کاملاً بادشاہ کے ہاتھ میں محفوظ ہیں یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ قانون ساز جماعت جو بادشاہ اور حکومت کی خدمت میں رعایا کے صحیح جذبات کی ترجمانی، اس کی ضروریات کے اظہار اور حکومت کے ساتھ اشتراک عمل کے لئے مقرر کی گئی ہے، اس میں مسلمانوں کا موقف کافی مضبوط ہے یا نہیں؟ جب تک یہ دو چیزیں حاصل نہ ہوں مسلمان کسی دستوری تبدیلی کا ساتھ نہیں دے سکتے اور جس لمحہ یہ دونوں مقاصد حاصل ہو جائیں مسلمانوں کو اشتراک عمل میں عذر نہیں ہو سکتا اور نہ ہونا چاہیئے۔"

(خطبۂ صدارت جلسہ سالانہ مجلس اتحاد المسلمین ۱۹۴۰ء)

## مسئلہ وفاق

لارڈ لنلتھگو (ویسرائے ہند) کے زمانہ میں دیسی ریاستوں سے متعلق سب سے اہم مسئلہ "وفاق" کا تھا، وفاق نہ صرف دیسی ریاستوں کے اقتدار کے لئے ایک پیام موت تھا، بلکہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے حق میں سم قاتل کا حکم رکھتا تھا، کانگریس اسی وجہ سے اس کی پر زور تائید کر رہی تھی کہ مرکزی حکومت میں اس کا اقتدار اتنا زیادہ وسیع ہو جائے گا کہ نہ صرف غیر کانگریسی برطانوی صوبے بلکہ تمام دیسی ریاستیں بھی اس کے سایۂ عاطفت میں محروم نہ رہ سکیں گے، اس طرح ہندوستان کے طول و عرض میں اسی کا ڈنکا بجنے لگے گا، حیدرآباد کے سیاسی اقتدار کے حصول کی جو کوشش مہاسبھا اور آل انڈیا اسٹیٹ کانگریس کے ذریعہ ناکام رہی وہ وفاق کے ذریعہ بہ آسانی پوری ہو سکیگی ——— حکومت حیدرآباد، بالفاظ دیگر "حیدری حکومت" اس طرف کلیتہً جھک چکی تھی اور اگر اس وقت مرحوم نے چپہ چپہ پھر کر، تقریریں کر کے اور نازک ترین

حالات کا احساس پیدا کرا کے عوام کو مرکزیت اور استحکام کی دعوت نہ دی ہوتی تو شاید دفاق کے عملی جامہ پہننے میں کوئی دشواری نہ ہوتی، مرحوم نے اِن نازک مواقع پر پوری سرفروشی اور جرأت سے کام لیکر نہ صرف مسلمانوں کی بے بہا خدمت انجام دی بلکہ جاگیرداری کا پورا پورا حق ادا کیا، وفاشعاری کا کامل ثبوت بہم پہنچایا اور دوسروں کی آنکھیں کھولدیں۔

**معاہداتی مرتبہ**

مرحوم اس بات پر بہت زور دیتے تھے کہ حیدرآباد کا موقف دوسری دیسی ریاستوں سے قطعاً جداگانہ ہے، کیونکہ حیدرآباد کے معاہدات وزیرِ ہند سے نہیں بلکہ راست تاج برطانیہ سے ہوئے تھے، معاہدات کی حیثیت مساویانہ تھی ———— اِنہی حقائق کی بنا پر وہ اعلیٰ حضرت خسرو دکن کو بجا طور پر "ہزاکسلنسی" کی بجائے "ہز میجسٹی" کہتے تھے ———— سنہ ۱۹۴۰ء کے خطبۂ صدارت میں تحریر فرماتے ہیں :-

"اِس سلسلہ میں چند اور امور کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ بہی خواہانِ سلطنتِ آصفیہ نے خصوصاً اور ہندوستان کے سارے مسلمانوں نے عموماً برسوں سے اس تمنا کو اپنے سینوں میں پرورش کیا ہے کہ وہ اعلیٰحضرت کے اسم گرامی کے ساتھ "ہز میجسٹی" یا "جلالۃ الملک" کے الفاظ اِستعمال کریں اس کے لئے جس کسی نے کوئی آواز بلند کی تو اس نے اپنے نزدیک غلط طور پر یہ تصور کر لیا کہ اعلیٰحضرت کی ذات گرامی اپنے القاب وخطابات کے لئے کسی کی اجازت وعطا کی پابند ہے، میں جہاں تک حیدرآباد کی تاریخ اور اس کے معاہدات پر نظر ڈالتا ہوں اعلیٰحضرت کو اس لقب کے اِختیار کرنے میں کسی کی اجازت ورضامندی کا پابند نہیں پاتا اور کوئی وجہ نہیں سمجھتا کہ مسلمانانِ دکن بلکہ مسلمانانِ ہند آج ہی سے اعلیٰحضرت کو ہز میجسٹی یا جلالۃ الملک کے

لقب سے کیوں نہ یاد کریں۔ بعض مستند روایات کے مطابق آصفجاہ رابع نے اس وقت جبکہ اکبر وعالمگیر کے نسلی ونسبی جانشین تخت دہلی کو زینت دے رہے تھے، اپنے اعلان خودمختاری کے باوجود ہزمیجسٹی کا لقب اختیار کرنے کو شان وفاداری کے خلاف تصور کیا تھا۔ لیکن آج سارے ہندوستان میں اگر کوئی لفظ اور معنی کی پوری صحت کے ساتھ شہنشاہان مغلیہ کی جانشین اور ہندوستان میں ہزمیجسٹی کے لقب کی مستحق ہوسکتی ہے تو وہ آصفجاہی سلاطین ہی کی ذات ہوسکتی ہے۔"

جہاں تک ریاست کے حدود کا تعلق ہے، معاہداتی رو سے اس میں اور بھی وسعت ہو جاتی ہے، یہ علاقے وہ ہیں جو صرف فوجی اخراجات کے لئے سلاطین آصفیہ نے انگریزوں کے سپرد کئے تھے ـــــ جب انگریزوں نے ہندوستان کو مقبوضاتی درجہ دینے کا وعدہ کیا تو مرحوم نے پورے شد ومد کے ساتھ اس پر زور دیا کہ حیدرآباد کے علاقے سب سے پہلے واپس کر دیئے جائیں چنانچہ فرمایا ـــــ

" ہماری حلیف سلطنت برطانیہ نے ہندوستان کو مقبوضاتی مرتبہ دینے کا وعدہ کیا ہے، اس کے صاف الفاظ میں یہ معنی ہیں کہ اس کو وہ حقوق حاصل ہوجائیں گے جو نیوزی لینڈ، اور آسٹریلیا کو حاصل ہیں ـــــ آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس درجہ کی بنا پر آئرلینڈ شریک جنگ نہیں ہے ـــــ لیکن یہ سب کس کو ملے گا؟ سلطنت برطانیہ کے دشمنوں کو! کیا آپ نہیں جانتے کہ انھوں نے گذشتہ پچاس سال سے برطانیہ کا ناطقہ تنگ کر رکھا ہے، کیا آپ توقع کر سکتے ہیں کہ حیدرآباد کو جو ان کی عزت، ان کی حفاظت کا ضامن اور ہندوستان میں ان کے قیام کا باعث اولین رہا ہے

اپنے معاملات کو آپ طے کرنے کا حق نہ ہوگا؟ ظاہر ہے کہ مدافعت کے جو وعدے ہمارے حلیف نے کئے، کیا ان کی ضرورت رہے گی؟ نہیں رہے گی! —— اور جب نہیں رہے گی تو کیا ان مقبوضات کے اپنے حلیف کے قبضے میں رہنے کی ضرورت ہوگی؟ ہرگز نہیں، ہندوستان کو مقبوضاتی درجہ ملنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ علاقے جو اپنے فوجوں کے اخراجات کے لئے تھے، ہم کو واپس مل جائیں گے۔

اب جبکہ ہندوستان کے غلاموں کو خود انفصالی معاملات کے حقوق مل جائیں گے تو کیا ہمارے مقبوضہ اختیارات حلیف کے پاس باقی رہیں گے؟ ہرگز نہیں۔ اس کے دوسرے الفاظ میں یہ معنی ہیں کہ ہم کو خود مختاری زیادہ سے زیادہ حاصل ہو جائے گی، ایسی جس کے ذریعہ ہم کو دوسرے دول کے ساتھ تعلقات قائم کرنے اور اپنے دفاع کا آپ انتظام کرنے کا حق ہوگا۔

مملکت آصفیہ اسلامیہ کے مقبوضات کی واپسی کے بعد ہمارے حدود اس قسم کے ہوں گے کہ ہم مشرق میں خلیج بنگال پر وضو کریں گے، جنوب میں سلطان شہید کی مزار پر فاتحہ پڑھیں گے اور شمال میں واردھا کی سرحدوں پر کھڑے ہو کر گاندھی جی کو نمسکار کریں گے۔ یہ مطالبہ نہیں بلکہ ہمارا حق ہے۔ میں خود مختاری کا دن منا رہا ہوں اور میں اپنی حیثیت کا اعلان کر رہا ہوں اور جس کو ہر مسلمان کے قلب میں جاگزیں ہو جانا چاہیئے۔ —— (سیاسی تقاریر)

**خسرو دکن سے عقیدت** | سیاست کوئی سیدھی سادھی ڈگری کا نام نہیں بلکہ بڑے ہی پیچیدہ اور پرخطر

راستہ کا نام ہے ـــــــ بحرِ سیاست کے مد و جزر کو وہی ملاح سمجھ سکتا ہے جس کا تجربہ بہت وسیع ہو، جس نے انتہائی مد و جزر میں کشتی کو بچا کر ساحل تک پہنچانا سیکھا ہو، دور کھڑے دیکھنے والوں بلکہ خود کشتی کے سواروں کو بعض دفعہ ملاح کی ترکیبوں اور چالوں پر شک ہونے لگتا ہے، اور دراصل سیاست میں قوم کی صلاحیت کے پرکھنے کا یہی مقام ہوتا ہے ـــــــ حیدرآباد کی سیاست میں ۱۹۴۳ء سے قبل کے چار پانچ سال نہایت نازک رہے ہیں، اغیار کے پروپگنڈے، اپنوں کی معصومیت، ایسی چیزیں تھیں کہ اگر قائد محمد بہادر خاں سا صاحب ہمت و عزیمت نہ ہوتا تو کبھی کا میدان سیاست سے بھاگ نکل گیا ہوتا ـــــــ کیسے کیسے پروپگنڈے ہوئے! بد دیانتی کا الزام لگایا گیا سیاست سے ناواقفیت کی چوٹیں کسی گئیں۔ جب یہ تمام داؤ کام نہ کر سکے تو ایک آخری اور بڑی ہی تیز گولی یہ چلائی گئی کہ یہ اعلیحضرت خسرو دکن کے خلاف ایک زبردست محاذ قائم کر رہے ہیں۔ یہ کوئی معمولی چال نہ تھی! مختلف طریقوں سے خسرو دکن پر اس کی صداقت کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ـــــــ اسی اثنا میں اس مردِ حق کی ایک تقریر ہوئی جس کے صداقت پسندانہ جملوں نے اس تشہیر کو اور بھی تقویت پہنچائی، مرحوم نے مارچ ۱۹۴۳ء کو بمقام ورنگل رسم پرچم کشائی کے موقع پر اس حقیقت کا اظہار فرمایا:۔

"میں علی الاعلان کہتا ہوں کہ یہ علم چین قلیچ خاں آصفجاہ اول یا نواب میر عثمان علی خاں کا نہیں ہے ـــــــ اگر اشخاص کا علم ہے تو میں اس کے واسطے مرنے کو تیار نہیں ہوں۔ میں اس کو شخصی علم نہیں سمجھتا ـــــــ میرا اور

مجلس اتحاد المسلمین کا یہی مسلک ہے کہ یہ اسلامی علم ہے ؟
(رہبر دکن ۶ مارچ ۱۹۴۳ء)

کیا واقعی اِن جملوں سے خسرو دکن کے خلاف ایک محاذ قائم ہو رہا تھا یا تخت و تاج کی حفاظت کے سامان ہو رہے تھے؟ میدان سیاست کا ایک نووارد بھی اس کی پنہاں حقیقت کو پہچان سکتا ہے، مگر اغیار اور دشمنوں کے لئے کیا یہ صاف گوئی کافی نہیں؟ —— غلط باور کرایا گیا اور ایک سال کے لئے تقریر کی ممانعت ہوگئی، لیکن آخر حق بات ظاہر ہو کر ہی رہی خسرو دکن، جو محمد بہادر خاں کی روح عمل سے ناواقف نہ تھے سمجھ گئے کہ ان پروپگنڈوں میں اصلیت کتنی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ پھر وہی پرانے تعلقات قائم ہوگئے، اگر ایسا نہ ہوتا تو محمد بہادر خاں کی رحلت پر ان کی زبان سے اعتراف خدمات کے یہ الفاظ نہ نکلتے:-

"یہ بڑا نازک زمانہ ہے اور یہ وقت ان کی خدمات کا تھا، جو کام انھوں نے قوم و مذہب کے لئے انجام دیئے وہ ان کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ اِنسان کی قدر مرنے کے بعد ہوتی ہے۔ ان کا بدل نہیں مل سکتا۔ سیکڑوں برس صبح و شام کی گردشوں کے بعد دنیا ایسا آدمی پیدا کرتی ہے جو اپنی صفات اور خدمات کی وجہ سے قوم میں ہر دل عزیز ہو جاتا ہے۔
(اخبار تنظیم قائد ملت نمبر ۱۳۶۳ھ)

اور پھر مادۂ تاریخ رحلت کے ذریعہ کیوں وفاشعاری کی ایک اور مہر ثبت کی جاتی ہے؟:-

گرفتہ بخششے از دست قادر
برائے حفظ حق قوم نادر
بگفتہ کار او در گوش عثمان
بہادر بود و خود در جنگ ما ہر
۱۳۶۴ھ

نوٹ:- ہرچہ خدمات بے لوثانہ او برائے قوم و ملت خویش انجام دادہ بود ضرور قابل ستایش وہم ایں اَمر بہ شکل یادگار او در قلوب آنہا خواہد ماند بہ تشکر و امتنان علاوہ موروثی جان نثاری ملک و مالک۔
خدا او را غریق رحمت بکناد
(تنظیم، قائد ملت نمبر)

ادھر سے اعتراف وفاداری کا یہ رنگ، اور ادھر محمد بہادر خاں بغیر اپنی وفاداری کے داد کی خواہش کئے اپنے کام میں اسی طرح منہمک
زباں بندی کے ایک سالہ دور میں بعض معاندین نے ان کو خسرو دکن کے خلاف اکسانے کی امکانی کوشش کی، شاید بہادر خاں کو ایسا ہی دوں فطرت اور کم ظرف سمجھ رکھا تھا ------ ۱۹۴۴ء میں جب خاموشی کی مدت ختم ہوئی اور رکھنے کا موقع ملا تو دار السلام کے بھرے مجمع میں یہ اعلان ہوا۔
"خوب یاد رکھیں میں اس کا دوست نہیں ہوں جو مسلمانان دکن کے اقتدار سیاسی و تمدنی کے مظہر اعلیحضرت

شاہ دکن و برار سے غیر متزلزل وفاداری و عقیدت نہیں رکھتا۔
میرا ہاتھ اس کی آنکھیں نکال لیگا جو ان کی طرف ٹیڑھی نظر سے
دیکھے اس کی زبان کھینچ لے گا جو ان کی شان میں ناشائستہ حرکت
کا ارادہ کرے ——— وہ ہماری ریاست کے محور ہیں اور
ان کے استحکام و بقا پر ہمارے استحکام و بقا کا انحصار رہے۔"

(رہبر دکن، مارچ ۱۹۴۴ء)

**بادشاہ پرستی کا الزام** جب ہر چال الٹی ہی پڑتی گئی، اور ہر کاٹ غلط ہی نکلی تو اب چند پڑھے لکھے جہلا، اور چند دوکاندار

عالموں نے "بادشاہ پرستی" کا الزام دہرانا شروع کیا، خوب اچھال اچھال کر بتایا گیا کہ محمد بہادر خاں دعویٰ تو کرتا ہے اسلامی حکومت کے قیام کا، باتیں تو بگھارتا ہے مرکزیت کے دینی فوائد کی اور حقیقتاً "بھٹکا رہا ہے غیر اسلامی راستہ کی طرف"۔ "بادشاہ پرستی" کا درس، جو یہ ہر تقریر میں دیا کرتا ہے، ہے کہیں اس کا وجود اسلامی تعلیمات میں؟ ——— پہلا تیر چلایا گیا تھا بادشاہ کو ناراض کرنے کے لئے، یہ کمند پھینکی گئی ہے عوام کو خلاف کرنے کے لئے ——— یہ الزام لگایا تو دکن ہی میں گیا لیکن پنجاب کے ایک گوشے سے اسکی تصدیق مزید بھی حاصل کی گئی ——— قومی مفاد کے اعتبار سے یہ داؤ پہلے سے بھی زیادہ خطرناک تھا، لیکن اس میں بھی دشمنوں کو وہی ہزیمت اٹھانی پڑی جو اور حملوں سے اٹھائی تھی ——— جس کی تائید پر اللہ تعالیٰ ہو اسے کوئی کیا نقصان پہنچا سکتا، جس نے آج تک اسلام کی خاطر اپنے روپے کو پانی کی طرح اور اپنے خون کو پسینا کر کے بہایا، وہ آپ "بادشاہ پرستی" کا درس دے گا؟ جس کے پیش نظر رضائے الٰہی کا حصول تھا اور جس کی

اس نے آرام و آسائش کو تج کر مصیبت و پریشانی اختیار کی وہ آج اتنا قبیح جرم کریگا! ـــــــ اس نے بہت پہلے ہی اِس معاملہ کو صاف کر دیا تھا، اور خفیہ نہیں بلکہ دارالسّلام میں (۵۰۰۰۰) ہزار کے کثیر اجتماع میں بہ بانگ دہل جتا دیا تھا؛ ایک ایک لفظ غور سے پڑھو اور اس مردِ حق کی حقانیت کا اندازہ لگاؤ:۔

"یہ نہ سمجھنا کہ میں شاہ دکن کی خاطر مر رہا ہوں اور جان دے رہا ہوں۔ میں عبدالملک نہیں، عبداللہ ہوں، اور دنیا کا کوئی صاحب ایمان عبداللہ کے سوا، اور کچھ نہیں ہوتا میں تخت و تاج آصفی پر اس لئے قربان نہ ہونگا کہ وہ جلالت الملک میر عثمان علی خاں کا تخت و تاج ہے۔ کسی فرد واحد کے لئے میری قربانی نہ شہادت ہے نہ ایثار، اور نہ خدا کے پاس اسکی کوئی جزا۔ میں اپنی قربانی کو اور اس کی جزا کو زائل کرنا نہیں چاہتا، یہی وجہ ہے کہ میں تخت و تاج آصفی اور اقتدار شاہانِ آصفیہ پر اس لئے قربان ہونا چاہتا ہوں کہ میں اس اقتدار کو ملت اسلامیہ کا اقتدار، اور اس تخت و تاج آصفی کو ملت اسلامیہ کے اقتدار کا مظہر تصور کرتا ہوں، اور اقتدار ملت اسلامیہ، اعلاء کلمتہ الحق کے سوا کسی اور مقصد کے لئے نہیں ہوسکتا، لہٰذا میں حفاظت تخت و تاج آصفی اور تحفظ اقتدار شاہی کو تحفظ ملت اسلامیہ و اعلاء کلمتہ الحق سمجھتا ہوں، اور اسی راستہ میں مٹنے کو موت نہیں بلکہ شہادت اور حیات ابدی تصور کرتا ہوں۔"

(سیاسی تقاریر قائد ملت)

یہ تھی اغیار کے الزام " شاہ پرستی " کی حقیقت ——— کیا حماقت ہے کہ لوگ آفتاب پر خاک اُڑا کر سمجھتے ہیں کہ اس کا نورانی چہرہ گرد آلود ہو جائیگا! حالانکہ سچ تو یہی ہے کہ ان کی اڑائی ہوئی خاک انہی کی روسیاہی اور اندھے پن کا باعث بنے گی ——— یہی ہوا، اور تا قیامت ایسے حالات کا یہی نتیجہ نکلتا رہے گا۔ " حق " ایک کمال ہے اور ہر کمال بغیر ظاہر ہوئے رہ نہیں سکتا! ———

**سیاست و مذہب**

دین اسلام کیا صرف عبادات ہی کا نام ہے؟ معاملات اخلاق اور دوسرے معاشری مسائل اس کے دائرہ سے خارج ہیں؟ کیا کسب معاش کی راہیں، طرز حکمرانی کے ڈھنگ اور تحفظ ملت کے اصول کسی اور جگہ سے سیکھے جائیں؟ زوال پذیر قوموں کو سنبھالنے، ابھارنے اور بڑھانے کے لئے مغرب کا رُخ کیا جائے؟ — ہر سوال کا جواب نفی ہی میں ملے گا ——— اسلام کی اساس قرآن اور سنت رسول ہے، اور قرآن، پنڈتوں کے خود ساختہ رسومات کا مجموعہ (وید) نہیں، کرشن کی کوئی تقریر (بھگوت گیتا) نہیں، پادریوں کی تحریف کی ہوئی کتاب (انجیل) نہیں [نعوذ باللہ من ذالک] بلکہ یہ ایک نسخہ شافی ہے، اکسیر اعظم ہے جس سے انسانیت کے ہر دکھ اور درد کا علاج ہو سکتا ہے، یہ ایک نظام حیات ہے جس میں انسانی زندگی کے انفرادی و اجتماعی، مادی و روحانی ہر ہر پہلو کی پرورش کے یکساں سامان مہیا ہیں؛ نہ عمرانیات کا کوئی مسئلہ اس کی وسعتوں سے خارج، نہ سیاسیات کا کوئی گر اس کی گہرائیوں میں ناپید ——— پھر دریوزہ گری کی کیا ضرورت اور جب قرآن پورے نظام حیات پر حاوی ہے تو سیاست اور مذہب کا فرق کیسا؟ ——— کم فہموں اور بدخواہوں نے محمد بہادر خاں جیسے مرد مومن کی معاونت سے یہ کہہ کر ہاتھ چھڑائے کہ

تم سیاس ہو' سیاست تمہارا مسلک ہے' ہم مذہب کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں۔ ع بریں عقل و دانش بباید گریست

مغربی سیاست کے گھائل اور اسی میں اپنی فلاح دیکھنے والے ہونگے مذہب سے الگ' ہوگی ان کی سیاست' مذہب سے جدا' مگر محمد بہادر خاں تو ایسی سیاست کو "شیطنت" کے الفاظ سے یاد کرتے تھے' کیوں کہ انہیں خوب معلوم تھا۔ ع

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

ان کی کونسی گفتگو اور کونسی تقریر ہوتی جس میں مذہبی رنگ غالب نہ ہوتا تھا۔ مثلاً ۱۳۵۹ھ کے خطبۂ صدارت (مجلس اتحاد المسلمین) کے یہ جملے پیش ہیں:۔

"قرآنی تعلیمات کے سوا اور کونسی چیز تھی جس نے ایک بدوی کو تاج خسرو اور تخت کسریٰ کا مستحق بنا دیا تھا' مجلس اتحاد المسلمین ہر اس سیاست کو جو قرآن کے منبع فیض سے سیراب نہیں ہے سراب سے زیادہ حیثیت نہیں دیتی۔ یہی وجہ ہے کہ انتہائی تنظیمی وسعت کے بعد بھی اس نے جو دستور اپنے لئے مرتب کیا ہے اس میں اپنے وجود کی پہلی غرض اعتصام بحبل اللہ قرار دی۔ زمانہ نے ممکن ہے راستہ میں کچھ تبدیلی کر دی ہو لیکن منزل اگر قرآنی منزل نہیں ہے تو وہ ذلت و خواری کے جہنم کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج میں آپ کے منتخب کردہ خادم اور اس مجلس کے صدر کی حیثیت سے آپ سب ارکان مجلس اتحاد المسلمین پر عموماً اور ارکان عاملہ و شوریٰ ملکتی مجلس' صدر صاحبان و عہدہ داران مجالس ضلع و ابتدائی اور مبلغین مجلس اتحاد المسلمین پر خصوصاً رکنیت مجلس

کی شرط اوّلین کے طور پر یہ پابندی عائد کرتا ہوں کہ ہم میں سے ہر ایک عمل کی نیت سے اور معنی و مطلب کو سمجھکر قرآن مجید کی کم از کم تین آیتیں روز تلاوت کرے اور اس پر نہ صرف اپنے خدا کو گواہ ٹھیرائے بلکہ ماہواری تختۂ رپورٹ میں جو مملکتی مجلس کو روانہ کیا جاتا ہے، بہ صداقت دل اطلاع دے کہ وہ کس حد تک اِس شرط کا پابند رہا ہے —— میرے اس عمل پر مزاولت نے ثابت کر دیا ہے اور انشاء اللہ بہت جلد آپ پر ثابت ہوگا کہ قرآن کس طرح آپ پر فلاح و صلاح کی اِنفرادی و اجتماعی راہیں کھولتا ہے۔" (سیاسی تقاریر)

یہی مذہب آمیز سیاست کا رنگ مرحوم نے مسلم لیگ پر چڑھانے کی کوشش کی، مرحوم کی اس صفت کی تصدیق وقت کے بڑے مورخ، عالم اور عارف حضرت علامہ سید سلیمان ندوی کی زبانی حاصل کیجیے؛ خوب غور سے سنیئے کہ کن الفاظ میں تصدیق ہو رہی ہے:۔

" مرحوم کا مذاق مذہب آمیز سیاست تھا، ان پر دینی سیاست کا راز کھل چکا تھا، اور یہی راز سب کو بتانا چاہتے تھے، اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا جاتا تھا، ان کا یہ رنگ تیز سے تیز تر ہوتا چلا جاتا تھا، یہاں تک کہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ کراچی کے بعد سے لیگ کے خالص دنیاوی سیاسیوں پر ان کی تقریر بار ہونے لگی تھی"

(معارف اگست ۱۹۴۲ء)

تصدیق مزید کے لئے ایک اور عالم و عارف کے اِن جملوں کو بھی پڑھ لیجئے:۔

" ہندوستان نے اگر دوسرا محمد علی پیدا کیا ہوتا تو وہ یہی تھا۔ وہی

اخلاص، وہی دینی جوش، وہی تڑپ، وہی سوجھ بوجھ، وہی نبض شناسی وہی ہمت و عزم، بجز محمد علی کی انگریزی انشاء پردازی کے سب کچھ وہی! ——— لیگ کی مذہبی بے راہ روی کی جب کوئی شکایت سننے میں آتی (''سننا'' اس لئے شرکت کا اتفاق بطور تماشائی کے بھی ابھی تک نہیں ہوا) دل کو برابر یہی اطمینان رہتا کہ بہادر یار جنگ جیسے مومن صادق کی ذات دیر سویر انشاء اللہ ہر غلطی کی اصلاح کرائے گی —

(حضرت مولانا عبدالماجد دریا بادی ۔ صدق ۱۹۴۴ء)

اب بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ محمد بہادر خاں ایک نرے سیاس تھے اور ان کی سیاست مغربی رنگ کی شیلنت تھی ؟

# آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کا قیام

مرحوم کے سیاسی تدبر کا ایک اور اعلیٰ نمونہ، مسلمانانِ ہند کی فلاح کے لئے ان کے تڑپتے ہوئے دل کی ایک اور نشانی، آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کا قیام ہے۔ مسلم لیگ کا دائرۂ عمل صرف برطانوی صوبہ جات تک محدود ہے، دیسی ریاستوں کے معاملات میں دخل اندازی اس کا مسلک نہیں؛ کانگریس نے بھی اپنے حدودِ عمل برطانوی صوبوں ہی کی حد تک قرار دئے لیکن اس کی عیاریوں نے آریہ سماجی اور مہا سبھائی پروپگنڈے کی شکل میں، نیشنل کانگریس اور پھر روپ بدلکر اسٹیٹ کانگریس کی صورت میں بہت جلد ریاستوں کے امن کو تہس نہس کرنا شروع کیا ——
ہندو ریاستوں میں مسلمانوں پر مظالم پہلے ہی سے کیا کم تھے، اس یورش کی وجہ سے ان پر اور بھی تباہی آئی، لیکن ان کا سہیم و غمخوار کوئی نہ تھا وہ سہارے کی تلاش میں تھے لیکن کس پہ تکیہ کرتے؟ مظالم سے پس رہے تھے

لیکن کراہنے کی مجال نہ تھی، دبے جا رہے تھے لیکن اُف کرنے کی تاب نہ تھی ——— محمد بہادر خاں (اعلیٰ اللہ مقامہ) کی روح تڑپ اُٹھی، ذہن نے علاج سُجھایا، خیال، ارادہ اور عمل میں فاصلہ کب دیکھا گیا تھا، فوراً مجلس بنائی جس میں ہر دیسی ریاستوں کے پبلک نمائندے طلب کئے، اِس مجلس کا کام نہ ستیا گرہ کرنا تھا، نہ بھوک ہڑتال کے ناز کرنے تھے، نہ حکومت کے مالی نقصانات کرکے اس کو اپنی طرف متوجہ کرنا تھا، بلکہ اس کا مقصد صرف مسلمانوں کے جائز حقوق کی حفاظت تھی، تاکہ وہ اپنے تمدّن و ثقافت کی ایک حدتک حفاظت کرسکیں ———

خود مرحوم نے جنوری ۱۹۴۰ء کے خطبۂ صدارت (مجلس اتحاد المسلمین) میں اس کا یوں ذکر فرمایا ہے:۔

"گزشتہ دو سال کی عرض مدت میں حیدرآباد جس طوفان و ہنگامہ خیزی سے گزرا ہے، وہ کوئی اتفاق یا حادثہ نہ تھا، کانگریس نے اپنے ابتدائی دور میں اپنے آپ کو برطانوی ہند سے مخصوص اور ہندی ہندوستان سے بے تعلق ظاہر کرنے کی کوشش کی لیکن جیسے ہی حکومت برطانیہ نے وفاقی مجلس میں ریاستی نمائندوں کا سہارا لیا اور ان کو وفاق کی شرکت پر آمادہ کرنا شروع کیا، یہ سوال پوری شدّت کے ساتھ اٹھا کہ ریاستی نمائندے رعایا کے منتخب کردہ ہوں گے یا رؤسا کے نامزد کردہ ہوں گے۔ اول الذکر صورت کانگریس کے منشا کے مطابق تھی، اس لئے بظاہر اپنے آپ کو بے تعلق رکھکر کہیں بعض دوسرے مذہبی اور فرقہ وارانہ اداروں کے ذریعہ ——— جیسا کہ حیدرآباد میں ہوا ——— اور کہیں اپنے ذمہ دار ارکان مجلس عاملہ کے توسط سے، جیسا کہ راجکوٹ اور جے پور میں ہوا، رعایائے ریاستہائے ہند کو رؤسا کے

خلاف بھڑکانے اور ذمہ دارانہ حکومت کے مطالبہ کے ذریعہ اقلیتوں کے حقوق
پامال کرنے کی کوشش کی گئی، اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ پٹا بھی
سیتارامیا اور جواہر لال جیسے اہم کانگریسی لیڈروں نے اسٹیٹس پیپلز کانفرنس
کی صدارت کی، اس کے کانگریس کے ساتھ الحاق کا تصفیہ کیا، اور ریاستوں
کے ساتھ نہایت سخت رویہ اختیار کیا۔ اس کا گذشتہ اجلاس جو لدھیانہ
میں ہوا، حیدرآباد کے لئے ناقابل برداشت طور پر تکلیف دہ تھا ـــــ
دوسری طرف مسلم لیگ ریاستوں سے متعلق اپنی غیر جانبدارانہ
پالیسی پر قایم رہی، اور اس نے کانگریس کی طرح خفیہ اور بالواسطہ طریقے
اختیار نہیں کئے، بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ بعض موقعوں پر ریاستی مسلمانوں
کو مایوس کیا۔ ان تمام حالات نے دیسی ریاستوں کے مسلم باشندوں
پر اس ضرورت کو پوری طرح واضح کر دیا کہ وہ اپنے حقوق کی حفاظت کے
لئے ایک کل ہند نظام ترتیب دیں ورنہ اکثریت کا اکثریت ہونے کے
باوجود بیرونی طاقتوں سے ربط و تعلق اور اقلیت کا اقلیت ہونے کے
باوجود ایک دوسرے سے بے تعلق ہونا، ان کے مستقبل کو انتہا درجہ
تاریک اور خطرات سے پر بنا دے گا۔ میں نے محسوس کیا کہ یوں تو حیدرآباد
کے مسلمانوں کو جو مغلیہ شہنشاہیت کی عظمت رفتہ کے صحیح وارث ہیں،
سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی شاہراہ ترقی میں رہبری کرنی
چاہیئے لیکن کم از کم وہ اپنے اس فریضہ کی ابتدا، دیسی ریاستوں کے
مسلمانوں کی قیادت سے کریں۔ اس سے ایک طرف وہ مختلف ریاستوں
کے مسلمانوں کے درمیان ایک ایسا رشتہ اخوت پیدا کر سکیں گے جو ہر
ایک کی مضبوطی کا باعث ہو اور اس کو آنے والے طوفان جمہوریت میں

اپنے تحفظ کے قابل بنائے، تو دوسری طرف بالواسطہ وہ برطانوی ہند کے مسلمانوں کے ساتھ بھی تعاون و اشتراک عمل کر سکیں گے —— جے پور، جودھپور، اور بعض دوسری ریاستوں کے خونچکاں حالات اور گوالیار وکشمیر وغیرہ کی مسلم کش دستوری تبدیلیاں اس ضرورت کو اور بھی زیادہ محسوس کراتی ہیں —— چنانچہ میں نے اللہ کا نام لیکر ایک "آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ" کی تحریک ریاستی مسلمانوں کے سامنے رکھی اور ان سے خواہش کی کہ ایک مرکز پر مجتمع ہو جائیں اور اپنی انفرادیت کے تحفظ میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں —— اس ضرورت کو ہندوستان کے اور بھی بہت سے مفکرین محسوس کر رہے تھے، چنانچہ میری دعوت پر ہر طرف سے صدائے "لبیک" بلند ہوئی۔ میں جانتا ہوں کہ خود حیدرآباد میں میرے لئے اتنا وسیع میدان عمل موجود ہے کہ میرے بعض احباب میری اس تحریک کو قبل از وقت اور میری طاقت سے زیادہ تصور کرتے ہیں، لیکن میں یقین رکھتا ہوں کہ کسی کام کا شروع کر دینا مشکل ہوتا ہے، جب بیج درخت کی شکل اختیار کر لے تو رفتہ رفتہ اپنی نشو و نما میں باغبان کی توجہ سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور قدرت اس کے لئے سامان حیات مہیا کر دیتی ہے —— کتنے ہی ایسے اچھے خیالات ہیں جو انسانی دماغوں کے صندوق میں مقفل ہیں اور صرف اس لئے دنیا ان کی افادیت سے محروم رہی کہ سوچنے والوں کی پست ہمتی نے ان کو اٹھانے سے باز رکھا۔"

مرحوم کی اس تحریک پر ایک اعتراض یہ کیا جانے لگا کہ اس سے حیدرآباد کی انفرادیت جاتی رہے گی، حیدرآباد کی تاریخ اور اس کے روایات ایک جداگانہ شان کے حامل ہیں اس لئے اس کے اندرونی معاملات میں کسی غیر کی مداخلت ہرگز

روا نہیں رکھی جا سکتی، اِس اعتراض کا جو صحیح اور بصیرت افروز جواب مرحوم نے دیا وہ انھیں کی زبانی سنیئے، اِس اعتراض کو نقل فرماتے ہوئے جواب شروع ہوا:-

"لیکن گذشتہ دو سو سال میں اندازہ ہوا کہ اپنی انتہائی خوبی کے باوجود یہ نظریہ ہمارے لئے ایک دہوکہ ثابت ہو رہا ہے ——— ہندوستان کے وسیع سمندر میں موجیں اٹھ رہی ہیں، طوفان آ رہے ہیں، سطح مرتفع دکن کی خاک کے ذرے ان طوفانوں کو خود آگے بڑھکر دعوت دے رہے ہیں اور کشتیٔ دکن کے نام نہاد ناخدا، ان طوفانوں کو اٹھتا ہوا دیکھکر لرزہ براندام، حیات سے مایوس اور ہوام موج کے پہنچنے سے پہلے کشتی حیات کو غرق کر دینے پر مائل نظر آتے ہیں ——— مسافروں کو تھوڑی دور پر چٹان نظر آ رہی ہے اور وہ اس پر چڑھ سکتے ہیں، لیکن بیرونی طوفان کو دعوت نامہ لکھنے والا ہاتھ ان کو روکتا ہے کہ خبردار غیر کی اعانت حاصل نہ کرنا ——— میں کہہ چکا ہوں کہ حیدرآباد کی انفرادیت اور استقلال کی بقاء ضروری ہے، میں آج بھی اس کو مقصد حیات میں سے ایک سمجھتا ہوں اور کوئی ہرج نہیں سمجھتا کہ اپنی اس انفرادیت اور استقلال کو مضبوطی سے قایم رکھتے ہوئے وہ دوسروں کی طرف تعاون و اشتراک کا ہاتھ بڑھائے، یہ امر مجلس اتحاد المسلمین کی پالیسی کے اُسیطرح عین مطابق ہو جاتا ہے کہ مجلس تمام فرقہ ہائے اسلامی کو دعوت دیتی ہے کہ وہ اپنی اپنی انفرادی حیثیت میں اپنے جداگانہ اختلافی عقاید کو باقی رکھتے ہوئے مابہ الاشتراک امور میں دوسری جماعتوں سے تعاون و اشتراک عمل کریں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تحریک مستقبل میں نہایت کامیاب اور ریاستی مسلمانوں کے تحفظ و نجات کا ذریعہ بنے گی"

ایک اور شبہ پھر پیدا کیا گیا کہ آیا حیدرآباد میں اس کی وجہ دو جماعتیں ساتھ ساتھ رہیں گی (مجلس اتحاد المسلمین اور اسٹیٹ مسلم لیگ) اس کا جواب مرحوم نے یہ دیا:۔

"حیدرآبادی مسلمانوں کا ایک ہی واحد اور نمائندہ سیاسی ادارہ ہے اور اسی حیثیت سے میں نے مجلس اتحاد المسلمین کا تعارف قائد اعظم ملت اسلامیہ ہندیہ سے بھی کرایا تھا۔ اگر یہ آل انڈیا نظام کامیاب ثابت ہوا تو مجلس اتحاد المسلمین ہی اپنی ساری لفظی و معنوی خصوصیات کے ساتھ اس کی قیادت کرے گی اور اس میں وہی مقام حاصل کرے گی جو مملکت آصفیہ کو ریاستی ہندوستان میں حاصل ہے۔" —— (سیاسی تقاریر قائد ملت)

یہ تھے مرحوم کے خاکے، اور الحمد اللہ مرحوم کی حیات ہی میں ان کی بصیرت و سیاست دانی کے اچھے نتائج برآمد ہوئے، آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ" دیکھتے ہی دیکھتے چمک اٹھی اور اس کے سالانہ جلسے مسلم لیگ کے جلسوں کے ساتھ ساتھ ہونے لگے غیر ریاستی مسلمانوں نے بھی اس کے کاموں کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا —— سچ ہے، جو کام اللہ کی رضا کی خاطر اور اس کے بندوں کی فلاح کے لئے نیک نیتی کے ساتھ شروع کیا جائے تو اللہ کی برکتیں شامل حال ہو ہی جاتی ہیں۔

---

# مسلم لیگ اور قاید اعظم

**قاید اعظم** مثل مشہور ہے" جوہر کی قدر جوہری ہی جانے" بڑی ہستیوں کے بڑے کاموں کے سمجھنے کے لئے ایک اعلیٰ دل و دماغ کی ضرورت ہے ـــــــ مرحوم کے آگے نہ صرف ہندوستان کے مسلمان اور ان کے مختلف رہنما تھے، بلکہ کل اسلامی ممالک کے مسلمانوں اور وہاں کے لیڈروں کی حالت واضح تھی ـــــــ مرحوم نے ہندوستان کے مختلف رہنماؤں کی صلاحیتوں اور ان کی دیانت و خلوص کا بغور مطالعہ کیا تھا، دور سے نہیں، ہر ایک سے قریب تر ہو کر ان کے ظاہر و باطن کی یگانگت کا پتہ لگانے کی کوشش کی تھی ـــــــ مرحوم کی نگاہوں نے ہندی مسلمانوں کے لئے قاید اعظم محمد علی جناح (اطال اللہ عمرہٗ) سے زیادہ بے لوث، بے ریا، پرخلوص اور ماہر فن قاید کسی کو نہ پایا، مسٹر جناح کی اعلیٰ دماغی صلاحیتوں اور

ان کے تدبر و تفکر نے نواب صاحب کا دل موہ لیا تھا ـــــــــ مرحوم کا خیال تھا، (اور کس کو اس سے انکار کی مجال ہے کہ) قائدِ اعظم سے بڑھکر گاندھی کے بدلتے ہوئے پینتروں کو سمجھنے والا، حکومت برطانیہ کی چال بازیوں اور کرسامانیوں کو تاڑلینے والا کوئی اور نہیں ہوسکتا ـــــــــ جن لوگوں نے قائد ملت کو قائد اعظم سے ملتے دیکھا ہے وہی ان کے خلوص و محبت کا کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں، قائد اعظم کو دیکھتے ہی مرحوم کی رگ رگ میں فرحت و انبساط کی ایک لہر دوڑ جاتی اور چہرہ جو قلب و دماغ کی کیفیات کا سب سے بڑا آئینہ ہوتا ہے، یکایک دمک اُٹھتا ـــــــــ مرحوم، قائدِ اعظم سے اس طرح ملتے جیسے کہ ایک معمولی رضاکار، اور یہ ایک بیّن حقیقت ہے کہ قائدِ اعظم کا اِتنا پرخلوص، قابل اِعتماد اور جانباز سپاہی کوئی اور نہ تھا ـــــــــ وہ قاید اعظم جن کی زبان اپنے ساتھیوں اور ملت کے خادموں کی تعریف میں کبھی نہیں کھلتی، محمد بہادر خاں کی صفات عالیہ پر یوں دُرافشاں ہوتی ہے۔

> "اعلیٰحضرت حضور نظام کی رعایا کی حیثیت سے اگرچہ نواب بہادر یار جنگ کا کوئی دستوری تعلق مسلم لیگ سے نہیں ہے، لیکن بڑے بڑے نازک مواقع پر نواب صاحب میرے لئے معین اور رہبر ثابت ہوئے ہیں، نواب صاحب نے مسلمانانِ حیدرآباد کی تنظیم میں اپنی جس قابلیت کا ثبوت دیا ہے وہ ہم سب کے لئے باعث فخر و مسرت ہے ــــ خدا اُنھیں عمر دراز عطا کرے۔ آمین ــــ"

یہ اظہار حقیقت مرحوم کی حیات میں ہوا، جب رحلت فرماگئے تو وہ قائد اعظم جنھوں نے شاید ہی کسی کے سانحۂ ارتحال پر دو الفاظ بھی کہے ہوں، آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور کوئی تعزیتی پیام بھی نہیں دے سکتے، جب سنبھل جاتے ہیں تو

صرف اِتنا کہدیتے ہیں۔

"He was by heart and soul a "Huslim"

اور یہ بھی سُنا ہے کہ جب لیگ کی عاملہ میں قرارداد تعزیت پیش ہو رہی تھی، تو قائداعظم کے ضبط کا جام پُر ہو چکا تھا، اور حسرت آمیز محبت کی شراب ساغرِ چشم سے چھلک چھلک جا رہی تھی —— قائدِ اعظم کی یہ کیفیت عمر میں کتنی دفعہ پائی گئی؟ صرف دو بار —— ایک محمد علی کی وفات پر، دوسرے اِس مرد مومن کی رحلت پر۔

مرحوم کو بھی مسٹر جناح کی ذات سے ایسی ہی عقیدت و محبت تھی —— رات کے بارہ بجے ہیں مرحوم اپنے کام میں مصروف ہیں، (کیونکہ بارہ، ایک بجے، سے قبل سونے کی مہلت کہاں ملتی تھی) مجلس اِتحاد المسلمین کے ایک پُرخلوص کارکن مولوی حبیب محمد خاں صاحب بھی موجود ہیں، یونائیٹڈ پریس سے ایک تہلکہ انگریز خبر آئی، معلوم ہوا کہ کسی بدنیت نے قائدِ اعظم پر قاتلہ حملہ کیا تھا، خدا کا شکر ہے کہ جناح بچ گئے —— یہ خبر پڑھتے ہی دل و دماغ پر رنج، غصہ اور ساتھ ہی شکر و اِمتنان کی متضاد کیفیات کے گھٹا ٹوپ بادل چھا گئے، آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے، دیکھتے ہی دیکھتے سسکیاں بندھ گئیں، جب گھنٹہ بھر برس کر کچھ مطلع چھٹ گیا تو فرمانے لگے "خانصاحب آپ کیا جانیں قائد اعظم کو، ہمیں معلوم ہے کہ وہ کیا ہیں —— اگر آج خدانخواستہ کچھ ہو جاتا تو ملت اِسلامیہ (ہند) کی کشتی کو سنبھالنے والا تھا بھی کوئی اور؟" —— اس کے بعد پھر رونے لگے —— رات اسی طرح کٹی، صبح ہوئی تو پہلی ٹرین سے بمبئی چل پڑے ——

یہ تھا محبت کا عالم! ——

کتنی دفعہ مرحوم نے اپنے ملنے جلنے والوں کے سامنے اس امر کا اظہار کیا کہ "اگر میری دعا مقبول ہوتی تو میں اِلتجا کرتا کہ اے اللہ تو میری عمر کو گھٹا کر

قاید اعظم کو عمر طویل عطا فرمائے ـــــــ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنی مرتبہ اس کے حضور میں اس پرخلوص بندے نے اپنی یہ درخواست پیش کی، اور کیا تعجب کہ اسی کی قبولیت نے مرحوم کو اتنا جلد ہم سے چھڑا لیا ہو۔

مرحوم فرماتے تھے کہ مسٹر جناح پلیٹ فارم کے لیڈر رہیں، میدانِ عمل میں اتر آنا ان کے لئے ممکن نہیں، ساتھ ہی یہ بھی فرماتے کہ ان کا اسی مقام پر رہ کر کام کرنا زیادہ اولیٰ ہے اور اسیطرح وہ ملت کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکتے ہیں۔

مرحوم کا ایقان تھا کہ موجودہ حالات کے تحت قاید اعظم ہی ہندی مسلمانوں کے قائد ہو سکتے ہیں، وہ چاہتے تھے کہ مختلف صلاحیتوں کے لوگ لیگ کی مرکزیت کے تحت اپنے اپنے اصلاحی امور انجام دیں ـــــــ لیکن قاید اعظم پر سب سے بڑا حملہ ان کے مغرب زدہ ظاہر پر کیا جاتا ہے، اس کا جواب مرحوم نے روالپنڈی میں تقریر کرتے ہوئے (جب کہ وہ کشمیر سے نکالے گئے تھے) یہ دیا تھا:۔

> پہلے مسٹر جناح کی قابلیت اور قایدانہ صلاحیتوں کو بہت سراہا، پھر فرمایا: "مجھے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث یاد آتی ہے جس میں فرمایا گیا کہ مسلمانوں پر ایک وقت آئے گا جبکہ فاسق و فاجر اٹھ کر ان کی رہنمائی کریں گے، میں جناح کو اچھی طرح جانتا ہوں کیونکہ مجھے ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا ہے۔ وہ افرنگ زدہ مغربیت میں رنگے ہوئے ہیں۔ مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی صداقت پر اب پورا یقین ہو چکا ہے اور اسوقت کے مسلمانوں کی حالت اسکی پوری طرح تائید کر رہی ہے"۔

(مدینہ ۵ ستمبر ۱۹۴۳ء)

مرحوم فرماتے تھے کہ "میری اس تقریر کو، بڑے بڑے مسلم لیگیوں نے قاید اعظم کے خلاف سمجھا، اور مجھ سے استفسارات شروع ہوئے۔ میں نے ہر ایک کو یہی جواب دیا کہ ذرا غور تو کرو میں نے تائید کی ہے نہ کہ مخالفت۔"

**مسلم لیگ سے تعلق**

قائد ملت محمد بہادر خاں نے اللہ کی بے پناہ عنایتوں اور بخششوں کو بے دریغ لٹایا، دولت لٹائی، راحت و آرام نثار کیا، جسمانی قوتیں صرف کر دیں، دماغی صلاحیتیں وقف کر دیں ـــــ تڑپتے رہے تڑپاتے رہے، جہاں سردی پائی، حرارت کی لہر دوڑا دی، جہاں چنگاریاں نظر آئیں، بھڑکا دیا، بس جلنا جلانا ہی تو مقصد زندگی تھا، یہ مشرب کسی کو حدود و قیود رکھ سکتا ہے؟ ہر تحدید جذبۂ خدمت کے سیلاب سے ٹوٹتی گئی، ہر فصیل عزم کے ٹکراؤ سے ٹوٹتی گئی ـــــ صدر مجلس اتحاد المسلمین دیکھتے ہی دیکھتے صدر آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ اور پھر خود آل انڈیا مسلم لیگ کے قایدین میں سے سمجھا جانے لگا، بلا کی کشش اور غضب کی جاذبیت تھی، تقریر ہی میں نہیں خود ذات میں، صفات میں، اعمال میں، جو ایک دفعہ قریب ہوتا، چمٹ جاتا، فریفتہ ہو جاتا۔

مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر آتے ہی مرحوم کا وہ رنگ جما کہ ہر پچھلا رنگ مدھم پڑ گیا، اپنے اس اثر سے قاید مرحوم نے قاید اعظم کے بڑے بڑے کام انجام دیئے ـــــ سرحد میں سرحدی گاندھی عبدالغفار خاں کا سحر کس نے توڑا؟ جنوب میں راس کماری تک مسلم لیگ کا ڈنکا کس نے بجایا؟ ۱۹۴۰ء کا وہ تاریخی جلسہ جس میں تحریک پاکستان پیش ہوئی کس کی وجہ سے ہو سکا؟ ـــــ خاکساروں کی شورش سے حکومت نے [illegible]

تھی، مسلم لیگ کے سالانہ جلسے کے تمام اِنتظامات ہو چکے تھے، قاید اعظم دہلی پہنچ چکے تھے، لیکن یکایک اِس امتناعی حکم کی وجہ سے سارے عزائم ملیامیٹ ہو رہے تھے، ایسے وقت محمد بہادر خاں رح نے قاید اعظم کو یقین دلایا کہ " جلسہ ہو کر رہے گا اور ڈسپلن (نظم و ضبط) کا ذمہ دار میں ہوں! آپ مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے حکومت پر اس امر کا اظہار فرما دیجئے کہ وہ جلسہ کی اجازت دیدے، نظم و ضبط اور امن و سکون کا ذمہ دار میں (یعنی قاید اعظم) ہوں" قاید اعظم نے اپنے پرخلوص اور حوصلہ مندی ساتھی پر کامل اعتماد کرتے ہوئے اور اسکی قوت بازو کو محسوس کرتے ہوئے حکومت سے اپنی ذاتی ضمانت پر جلسہ کے انعقاد کا مطالبہ کیا، حکومت نے منظور کر لیا، مسلم لیگ کا صدر اور دیگر عہدہ دار لاہور پہنچے، قائد ملت نے خاکساروں میں دو تین ایسی اثر آفریں اور بصیرت افروز تقریریں کیں کہ ان کا بیجا جوش سب ٹھنڈا ہو گیا، اور جس شان و شوکت اور امن و سکون کے ساتھ لیگ کا یہ تاریخی اجلاس اختتام کو پہنچا وہ اظہر من الشمس ہے! یہ کوئی معمولی بات تھی؟

اس کے ماسوا لیگ کے عہدہ دار و عوام میں ذہنی انقلاب کس نے پیدا کیا؟ مذہب کی وقعت و عظمت کا سکہ سب کے دلوں پر کس نے بٹھایا؟ قرآن کی تلاوت اور سیرِ طیبہ کے مطالعہ کا ذوق کس نے بڑھایا؟ کراچی (دسمبر ۱۹۴۳ء) کی یادگار سالانہ جلسہ میں کس کی زبانِ حقیقت ترجمان یہ سُنا رہی تھی اور جتا رہی تھی کہ :-

" سن لو اور آگاہ ہو جاؤ کہ جس سیاست کی بنیاد کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر نہیں ہے وہ شیطانی سیاست ہے ....... میرے دوست جسمانی ناپاکی دور ہو سکتی ہے لیکن ذہن و فکر اور قول و عمل کی ناپاکی وہ گندگی ہے

جس کو دھونے کے لئے خدا نے انبیا جیسی ہستیاں پیدا کی تھیں۔ کیا ان ناپاکیوں کا مرکز بن کر، جھوٹ کو اپنا روزمرہ کا شعار بنکر، مکر و فریب میں مبتلا رہ کر ظلم و استبداد کو جاری رکھکر ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ ہم پاک ہیں؟ اور اگر ہم ان گندگیوں سے پاک نہ ہوئے اور ہمیں ہندوستان کے دونوں شمالی گوشوں میں خود مختار حکومتیں مل بھی گئیں تو کیا وہ پاکستان کہلانے کی مستحق ہوں گی؟

پاک بننے کی اس کوشش کو آج سے شروع کرو اور یاد رکھو کہ نہ صرف پاکستان میں رہنے کے لئے پاک بننے کی ضرورت ہے بلکہ پاکستان کے حصول کے لئے بھی پاک بننے کی ضرورت ہے —— مکر و زور کی سیاست، طالبان پاکستان کی سیاست نہیں ہو سکتی، آپ کی کونسل آف ایکشن کا سب سے پہلا طریقہ یہ ہوگا کہ پاکستان کی جنگ لڑنے والے سپاہیوں کو آج سے پاک کرنا شروع کرے، مگر آہ! یہ ایک حقیقت ہے کہ سپاہی اس وقت تک پاک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ایک ایک سپہ سالار پاک نہ ہو جائے —— سن لو اور یاد رکھو! اسلام کے عہد آخر کا سب سے بڑا مفکر کیا کہہ رہا ہے:- ع

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ
ہو جس کی طبیعت میں بوئے اسد اللٰہی

(اور ڈائیس پر بیٹھنے والوں کی طرف متوجہ ہو کر):-

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

لیگ کے عوام اور نرے سیاسوں کو مذہب کی بے خمار شراب کے جام کے

جام پلا کر اور ان کی محفلوں میں اس کے خم کے خم لنڈھا کر، ترکی کی راہ اختیار کرنے والوں کو مدینہ کی طرف پھیر دینا کوئی چھوٹا احسان ہے؟

مرحوم، رعایائے حیدر آباد سے ہونے کے سبب، لیگ کے رکن نہ تھے اور نہ جلسوں کے وقت اس کی کارروائیوں میں حصہ لیتے تھے، لیکن جب پوری کارروائی ختم ہو جاتی اور قانونی حیثیت سے جلسہ برخواست ہو جاتا تو قاید اعظم کے حکم سے مخاطب کرتے تھے ——— لیکن عوام کے لئے تو کارروائی کا اختتام ہی جلسہ کا آغاز ہوتا تھا ——— آدھ، پون گھنٹہ نہیں تین تین گھنٹہ تقریر ہوتی اور مجمع میں سے ایک شخص بھی انگڑائی نہ لیتا۔ تاثیر کا وہ دریا بہتا کہ لوگ مرحوم کے ہاتھ میں ایک آلۂ بے جان بن جاتے ——— یہی وجہ تھی کہ جب مرحوم نے لیگ کی "دس لاکھ کی اپیل" کے سلسلے میں مسلمانوں کو جھنجھوڑنا شروع کیا تو ایک گھنٹہ کے اندر (الہ آباد کے سالانہ جلسہ میں) ہزاروں روپیہ نقد، ہزاروں کے وعدے اور زیورات کی ڈھیر لگ گئی، یہی کیفیت کراچی کے جلسہ میں بھی دیکھی گئی ———

اسیطرح دہلی کے سالانہ جلسہ میں قاید اعظم نے نواب صاحب مرحوم سے فرمایا: میرا خیال تھا کہ اس جلسہ کے اخراجات، جس کا تخمینہ ایک لاکھ ہے، اسی جلسہ سے پورے ہو جائیں۔ میں نے اپیل کی تھی لیکن اب تک صرف چند ہزار جمع ہوئے ہیں" جلسہ کا آخری روز تھا، کارروائی ختم ہو چکی، برخواست کا اعلان ہو چکا، لوگ بجائے اٹھنے کے سنبھل کر بیٹھنے لگے، اشتیاق سے ڈایس کی طرف نظریں اٹھنے لگیں، کس کا انتظار تھا؟ وہی قاید ملت کا قاید اعظم نے اعلان کیا کہ "اب نواب صاحب تقریر فرمائیں گے" مسرت وحیات کی ایک لہر دوڑ گئی، قاید اعظم پہلے ہی اشارہ کر چکے تھے، پاکستان کی اہمیت وافادیت پر گفتگو ختم ہوئی اور نواب صاحب نے مسلمانوں کی غلا

کمزوریوں کا شمار شروع کیا اور یہ فرمایا کہ جو " مال کا ایثار نہیں کرسکتے وہ جان کیا دے سکیں گے "۔ یہ سننا ہی تھا کہ روپیوں اور چیزوں کی بارش ہونے لگی، قائد اعظم نے اعلان فرمایا کہ " میں صرف نقد لونگا "۔۔۔۔۔ صبح جو حساب لگایا گیا تو سوا لاکھ رقم وصول ہوچکی تھی، اب کون ہے جو قاید اعظم کی ایسی رضاکارانہ خدمات انجام دے؟ قاید اعظم کے آنکھوں سے آنسو نہ نکلتے تو اور کیا ہوتا، اس خلوص و قابلیت، بصیرت اور جذب اندرون سے اس قدر مالا مال ساتھی اب ان کو کہاں ملیگا۔

عمر ہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بیرون

**ایک کھٹک** باہر والوں کو مرحوم کی یہ ترقی اور ان کا یہ اثر کھٹک رہا ہوگا تو کونسے شبہ کی بات ہے، خود حیدرآباد میں جہاں روح حیات ان ہی نے پھونکی تھی، اور جن کی وجہ سے " بیٹروں " نے بھی " شاہ بازی " کی " رسم و راہ " سیکھنی شروع کی تھی، حسد کرنے لگے۔ صاف کہنے کی جرأت کہاں سے لاتے، البتہ جب زبان بندی کی مدت ختم ہوئی تو ایک جلسہ کیا گیا، مرحوم کی خدمات پر آفریں کہی گئی اور ساتھ ہی حسد کی چنگاری کو ہمدردی کی راکھ میں لپیٹ کر اس طرح پیش کیا گیا کہ :۔

" آپ حیدرآباد ہی کے ہوجائیں، حیدرآباد ہی آپ کی تمام تر توجہ کا محتاج ہے، بیرونی مصروفیات سے حیدرآباد کے امور کی بجا آوری پورے طور پر نہ ہوسکیگی وغیرہ۔

حالانکہ یہاں کا سب سے زیادہ بار مرحوم ہی کے دوش پر تھا، اور سب سے زیادہ کام ( باوجود اور مصروفیات کے ) مرحوم ہی کیا کرتے تھے،۔۔۔۔۔

مرحوم نے سپاس نامے کا جواب ان الفاظ میں دیا، جو ان کی بصیرت کا بہترین نمونہ ہے۔

"میرا مقصد حیات ایک اور متعین ہے، اور وہ ملت اسلامیہ کی خدمت ہے۔ آپ عام طور پر تمنا کرسکتے ہیں کہ میں ملت اسلامیہ کے ساتھ دکن کا لفظ بڑھا دوں اور مجھے اس میں عذر بھی نہیں ہے، کیونکہ میں خود دعویٰ نہیں کرسکتا کہ میں عالم ارضی پر بسنے والی ساری ملت اسلامیہ کی خدمت کرسکتا ہوں، مجھے اپنی محدود طاقت اور صلاحیت کا اندازہ ہے، خود انبیاء علیہم السلام کے حدود علم، جن کے ساتھ وحی والہام کی طاقتیں ہوا کرتی تھیں ہمیشہ محدود رہے، اور ساری صف انبیاء میں صرف ایک قدسی مرتبت ذاتؐ ہم کو ایسی ملتی ہے جس کے حدود عمل کافۃ الناس کے لئے بسیط ہیں۔ ان کے" غلاموں کی خاک پا کو اپنے لئے سرمۂ چشم بصیرت سمجھتا ہوں۔ غیر محدود خدمت کا دعویٰ کیسے کرسکتا ہوں، بے شک میرا مخدوم "ملت اسلامیۂ دکن" ہے ——

لیکن! آپ کو جاننا چاہیئے حیدرآباد، ہندوستان کے سمندر میں ایک جزیرہ ہے۔ اس سمندر سے جتنی سیاسی لہریں اٹھتی ہیں وہ لازماً اس جزیرہ سے ٹکراتی ہیں، اور کوئی شخص ملت اسلامیہ دکن کی صحیح خدمت نہیں کرسکتا جب تک وہ ہندوستانی سمندر سے اٹھنے والی سیاسی لہروں پر قابو نہ رکھتا ہو یا کم از کم ان سے قریب ترین یا راست واقفیت نہ رکھتا ہو۔ میری تمام بیرون حیدرآباد مساعی کی علت غائی انہیں لہروں سے قریب تر رہنے کی تمنا ہے —— کوئی شک نہیں کہ حیدرآباد سے باہر قدم رکھنے کے بعد میری روشنی طبع، میرے لئے بلا ہوگئی اور میرے نغموں نے ہر چمن میں میرے لئے ایک دام بچھا دیا اور ہر صوبۂ ہند نے چاہا کہ میں اس کے قفس کا اسیر ہو جاؤں لیکن آپ اطمینان رکھیں، دام چاہے کتنے ہی ہم رنگ زمین ہوں، ان کو

پہچانتا ہوں اور اگر کبھی ان میں پھنسا بھی ہوں تو عمداً اور اپنے پروں کی طاقت کا اندازہ کرکے اس یقین کے ساتھ پھنسا ہوں کہ دام کو لیکر اڑونگا اور صیاد سمیت حیدرآباد سے قریب ترکردونگا" (مارچ ۱۹۴۴ء دارالسلام)

اتنے صاف صاف اور سچے پکے خیالات کو پیش کرنے کے باوجود بعض نادان دوستوں کو اب بھی یہی خیال دامنگیر رہا کہ قاید ملت ہمارے ہی لئے مخصوص ہوجائیں، چنانچہ اسی سلسلہ میں ضلع ورنگل کے مسلمانوں نے ایک سپاس نامہ پیش کیا جس میں وہی سوال اٹھایا گیا۔ اب کی دفعہ مرحوم نے پھر جتایا:۔

"لب کشائی پر مبارکباد دینے کی بجائے زبان بندی پر دی جانی چاہیئے تھی۔ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے زاغ و زغن میں سے نہیں بنایا بلکہ ۔ ع

شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست
ایں سعادت قسمت شہباز و شاہین کردہ اند

میرا دل دکھتا ہے جب دیکھتا ہوں کہ وہ تعلق خاطر جو اپنی تنظیم اور اپنے مرکز سے ہونا چاہیئے، صدر جماعت اور قاید سے ہوتا جارہا ہے، ملت اسلامیہ کے تعلق کو اشخاص سے دیکھکر مجھے ڈر ہوتا ہے کہ اس کا تعلق خدا سے کم نہ ہوجائے ایسی حالت میں اگر میں صرف ہاہر کا ہوجاؤں تو تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ اشخاص سے آپ کا تعلق ٹوٹے اور اپنے دست و بازو پر بھروسہ کرنے لگیں"

(رہبر دکن ۱۷ اپریل ۱۹۴۴ء)

---

# آزمائشیں اور ایثار

چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلات لا الٰہ را (اقبال)

قرآن حکیم غیر مبہم الفاظ میں اِس حقیقت کا اظہار کر رہا ہے کہ اسلام کا آبِ حیات بغیر مصائب کے ظلمات سے گزرے ہوئے حاصل ہو ہی نہیں سکتا، الٓمّٓ ۚ احسب النَّاسُ ان یترکوٓا اَنْ یَّقُولُوٓا اٰمَنَّا وھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ○ (العنکبوت) کیا ان لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ وہ اتنا کہنے پر کہ ہم ایمان لے آئے (بری ہو جائیں گے) اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ تاریخ شاہد ہے کہ ان آزمائشوں سے نہ کوئی محقق ولی بچ سکا نہ برگزیدہ نبی۔
محمد بہادر خاں نے بچپن ہی سے قرآن کو خوب غور و فکر سے پڑھا تھا، محض حصول

ثواب کی نیت سے نہیں بلکہ عمل کی نیت سے ! انھوں نے " لا الہ " کہا اپنے قلب کی گہرائیوں سے اور پھر تیار ہو گئے قول کو فعل سے مستحکم کرنے کے لئے۔

آزمائشیں تو بچپن ہی سے شروع ہوئیں، کیونکہ اسی سن سے مسلمان ہونے اور مسلمان رہنے کا تہیہ کر چکے تھے، گھر کا ماحول مخالف ہو گیا، مدرسہ کی فضا مکدر کر دی گئی، بڑے سخت امتحان دینے پڑے لیکن استقامت کا پاؤں ذرا بھی نہ ڈگمگایا۔

جوانی آئی، عیش سامانیوں اور راحت افزائیوں کے ساتھ نہیں بلکہ پریشانیوں اور الجھنوں کے ساتھ ــــ آزمایا گیا کہ پہلی فرصت میں کیا عمل ہوتا ہے، رنگ رلیاں بڑھتی ہیں یا کفایت شعاری کے ذریعہ آبائی قرض وام کیا جاتا ہے! محمد بہادر خاں نے پہلا کام یہی کیا کہ قرض کی ایک ایک پائی ادا کر دی۔

اب بچت شروع ہوئی، مالی تفکرات دور ہو گئے، مقروضیت کی جگہ دولت کی فراوانی نے لی، یہ بڑا ہی سخت امتحان تھا کیونکہ مشہور ہے۔ ع

گر بدولت برسی مست نہ گردی مردی

تیس چوبیس برس کے جوانی سے سرشار بہادر خاں کے ہاتھ میں اتنا سخت پرچہ دیا گیا، لیکن اس نے مسکراتے ہوئے حل کر دیا، کہتے ہیں کہ جواب کی ابتدا، شاندار ہونی چاہیئے، بہادر خاں نے پہلا فقرہ "حج" کا لکھا دوسرا خدا کے حکم کے تابع "ارض خدا کی سیر" کا، تیسرا تبلیغ وانفاق فی سبیل اللہ کا غرض یہ نہ ہوا کہ ابتدا تو شاندار ہوئی تھی، درمیان میں کچھ یونہی لکھ دیا بلکہ ہر ابتدا سے انتہا اچھی ہی رہی، یہاں تک کہ جب پرچہ ختم ہو چکا تو نہ دماغ میں کوئی الجھن تھی نہ قلب میں کوئی کھٹک، نہایت مطمئن اور اسی طرح تبسم، یقین ہے کہ صدنی مد

نشانات ملے ہوں گے۔

دولت ہی کی آزمائش پر انتہا نہیں ہوئی " اولاد" بھی چھین لی گئی' ایک لڑکی دی گئی تھی' کتنی حسرتیں اور امیدیں اس سے وابستہ ہوں گی لیکن آٹھ سال کے اندر ہی اندر واپس لے لی گئی' محمد بہادر خاں نے ذرا بھی پروا نہ کی' اِدھر تدفین عمل میں آئی اُدھر مسلمانوں کے فلاح کی ایک کمیٹی میں جا شریک ہوئے اور برابر مشورے دیتے رہے۔

استقلال کا ایک اور امتحان لیا گیا' تحریص کی ایک کمند پھینکی گئی' صدارت عظمیٰ کی لالچ بتائی گئی' ہندوؤں نے ہندو مسلمانوں کی مشترکہ قیادت (ابوالکلام صاحب کی طرح) کے بار بار تحفے پیش کئے' دیکھا گیا کہ نام و نمود' شہرت و عظمت اس کا منشاء ہے یا ہر کام اللہ ہی کے لئے ہو رہا ہے' بہادر خاں نے ایک ہی ٹھوکر سے دونوں کو رد کر دیا تحریص کے سارے داؤ الٹے پڑے تو تخویف کی کمندیں پھینکی گئیں' حکومت کی جانب سے بھی اور غیروں کی طرف سے بھی' سر اڑانے کی خبریں پہنچیں' آثار بھی پائے گئے' جاگیر و خطاب چھیننے کی دھمکیاں دی گئیں لیکن ادھر سے جواب یہی ملتا گیا کہ " نہ جان میری نہ مال میرا' رہا خطاب کا مسئلہ تو مجھے اپنے ماں باپ کا رکھا ہوا نام جس قدر عزیز ہے اِتنا خطاب تو عزیز نہیں ہو سکتا۔" ———

اس سے بھی عزم میں پستی نہ آئی تو " شہر بدر کر دیا جائے گا" کا وار کیا گیا' فن دان اور مشاق بہادر خاں نے اس کا جواب " جائے خدا تنگ نیست' پائے مرا لنگ نیست" سے دیا اور اپنی کاٹ میں کامیاب رہا۔

تقریر کی دو دفعہ ممانعت ہوئی' حیدرآباد کی محفل میں " زبان بندی" کا دستور ہو گیا تو کیا دنیا کی اور محفلیں بھی ختم ہو چکی تھیں۔ حیدرآباد میں نہیں برطانوی ہند

میں تقریریں ہوا کیں۔ پھر ممانعت کے اس حکم کی تعمیل بھی ہر مرتبہ اسی شرط کے ساتھ ہوئی کہ

" میری خاموشی اس وقت تک کہ اس سے مسلمانانِ
حیدرآباد کا کوئی نقصان نہ ہو، جہاں میں یہ محسوس کروں گا
کہ اب میرا سکوت ملت اسلامیہ دکن کے لئے نقصان کا باعث
ہو رہا ہے تو فوراً اس بندش کو ختم کر دونگا۔"

کوئی غور کرے کہ یہ "زبان بندی" اور یہ بندش اختیاری تھی یا غیر اختیاری؟

یہ آزمائشیں خیر سہی بھی جا سکتی ہیں، لیکن جو یہ سب کچھ کر گزرے اور پھر بھی اسی پر بد دیانتی، اور بدنیتی کے الزام دھرے جائیں اور اس طرح اسکی عزت و آبرو پر حملہ کیا جائے تو انسان کی کمر ہمت بیٹھ نہ جائے گی؟ محمد بہادرخاں پر بد دیانتی کا، محض اپنی بڑھائی کی خاطر قوم کے نقصان کا، بے علمی اور ریاکاری کا، بعض دفعہ حکومت سے مل جانے کا غرض کونسا الزام تھا جو پوری قوت کے ساتھ اور اشتہار بازی کی پوری عیاریوں کے ساتھ لگا یا نہیں گیا، لیکن ان کے عزم وارادہ اور ان کی صداقت و دیانت اور للہیت نے دشمنوں کے تمام کید کو ایسا ختم کیا کہ پھر نہ ابھر سکے —— کیا یہ سب الزامات صرف دشمنوں ہی کی طرف سے لگائے گئے؟ نہیں بعض دوستوں نے بھی حسد کی بنا پر یہی کیا، لیکن جسے نہ دشمن کی پروا ہو نہ دوست کی، جس کا مقصد سب سے بچھڑے ایک کو محبوب و مقصود بنانا ہو، اسے کیا پروا کہ دوست کیا کہہ رہا ہے اور غیر کیا کر رہا ہے۔ غرض مرحوم نے اپنے ایثار، اور مستقل مزاجی اور عشق سے یہ ثابت کر دیا کہ

موجِد چہ بر پائے ریزی زرش
چہ فولاد ہندی نہی بر سرش

سارے امتحانات اور ساری آزمائشیں ختم ہوئیں لیکن پھر بھی ایک آزمائش رہ گئی، مرحوم نے جاگیر اور خطاب اپنی مرضی سے واپس فرمائے تھے وجہ یہ ہوئی کہ ایک فرمان شاہی نکلا کہ "منصب دار اور جاگیر دار ملازم سرکار تصور ہوگا" اور ملازمین سرکار کو پہلے ہی سے سیاسی مسائل میں حصہ لینے کی ممانعت تھی، اس طرح مرحوم کے لئے دو ہی صورتیں تھیں یا تو جاگیر کی فکر کرتے یا خدمت خلق پر ڈٹے رہتے، خود ہی ایک تقریر میں فرما چکے تھے:۔

"میں یقین رکھتا ہوں کہ یہ امتحان وفا کا وقت ہے، مجھ سے بڑھکر دنیا میں کوئی خود غرض، تن آسان، بندۂ زر اور نمک حرام نہ ہوگا اگر میں اس زمانہ میں محض اپنی جاگیر اور اعزاز کے خیال سے مالک اور ملت و ملک کی خدمت گزاری سے روگردانی کروں ——— یہ تو بہت مبارک ہوا کہ اب دیوانۂ کوئے محبت، جیب و دامن کی فکر سے بھی آزاد ہو رہا ہے"

جب وقت آیا تو اپنے اس قول پر آسانی سے عمل کر گئے، اور سب نے دیکھا کہ اس دست برداری کے بعد ان کی شگفتگی، اطمینان اور سکون میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ خود فرماتے تھے اور بڑے ہی موثر انداز میں فرماتے تھے کہ اب میں زیادہ سکون محسوس کر رہا ہوں" ——— جب سال بھر اس طرح گذار چکے تو پھر حکومت کی طرف سے بار بار جاگیر و اعزاز واپس لینے کی فرمائشیں کی گئیں مجلس اتحاد المسلمین کے عہدہ داروں نے بھی اس پر کچھ اصرار کیا لیکن اب

ان کو حقیقتاً نفرت ہو چکی تھی، اسی لئے مرتے دم تک انکار کرتے رہے اور ان کی بار بار کی دعا، اللّٰھم احیینی مسکیناً و امتنی مسکیناً وحشرنی فی زمرۃ المساکین پوری ہو کر رہی۔

ابتدائی زندگی سے حیات کے آخری لمحوں تک انھوں نے دولت و جان کا ایثار کر کے امیروں اور شکم پروروں کو عملاً یہ سبق پڑھایا کہ

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہے پرواز میں کوتاہی

---

# شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

## آخری زمانہ

وہ بجلی جو آسمانِ ہند کے گوشہ گوشہ میں کوندتی رہی اور جس کا منشاء ہی ہر باطل عمارت پر کڑک کر گرنا اور جلا کر راکھ کر دینا تھا۔ اب عدم کے پردہ میں ہمیشہ کے لئے چھپ جانے کو ہے، وہ چراغ جس سے سیاست کی مجلسیں نورانی اور مذہب کی محفلیں درخشاں ہوتی رہیں، اب بجھا چاہتا ہے۔

کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہلِ محفل
چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں

اَب ایسا بہادر مسلمان، ہمدرد قائد، بے غرض خادم قوم اور سچا عاشقِ رسولؐ ہمیشہ کے لئے چھن جائے گا، مسلمانانِ ہند تم اب نکتہ چینیوں اور

بدخواہیوں میں رہو اس کی تعریف میں زبانیں خشک کرلو لیکن وہ تو سب کچھ کرکے اب نتیجہ کا منتظر ہے!

محمد بہادر خاں کی ہر آنے والی گھڑی گزشتہ ساعت سے شاندار اور باجمال رہی، عمر کے آخری لمحہ تک ان کا ستارۂ اوج برابر چڑھتا ہی رہا——

مذہب آمیز سیاست مرحوم کا خاص وصف تھا جیسے جیسے زمانہ گزرتا جاتا تھا یہ رنگ تیز سے تیز تر ہوتا چلا جاتا تھا، دکن کے لوگ تو اس حیثیت سے خوش قسمت رہے کہ انھیں سب سے پہلے حقیقی سیاست کا درس ملا، لیکن لاہور کے سالانہ جلسہ (لیگ) کی تقریر نے سارے ہندوستانی مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں نری سیاست کے راگ آلاپنے والوں کے گلے بیٹھ گئے، کراچی کے اجلاس والی تقریر نے تو مسئلہ بالکل ہی صاف کردیا، ہر پڑھے لکھے اور عامی پر سیاست کا راز کھل گیا۔ نفس کے بندے اور خدمت خلق کا نعرہ لگا کر حکومت میں مقام حاصل کرنیوالے پریشان ہوگئے، اور حقیقت پسند افراد سنبھل کر اصلاح کی فکر میں لگ گئے——

مرحوم کی آخری تین چار برس بڑی مصروفیت کے رہے، مجلس اتحاد المسلمین کے مسائل، آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کی الجھنیں پھر خود مسلم لیگ کے تبلیغی کاموں نے پوری نیند تک حرام کردی تھی، رمضان شریف کے مہینوں میں تک آرام نصیب نہ ہوتا تھا، پھر مطالعہ کا شغف ایسا کہ ان تمام بکھیڑوں کے باوجود روزانہ علوم مذہبی اور معلومات حاضرہ کے ذخیرہ میں اضافہ کئے بغیر چین نہ آتا تھا، اس مسلسل جسمانی مشقتوں، دماغی کاوشوں اور قلبی موثرات نے مرحوم کو قبل از وقت بوڑھا بنا دیا، بال پکنے لگے، بغیر عینک کے پڑھنا مشکل ہوگیا، نزلہ اور گلے کے مرض نے مستقل صورت

اختیار کر لی تھی کہ سردیوں میں صبح دس بجے تک بلند آواز سے بات بھی نہ کر سکتے تھے، ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ غدود ( Ylamads ) نکال دیئے جائیں تو تکلیف رفع ہو جائے گی مگر چونکہ اس سے آواز پر بڑا اثر پڑتا تھا مرحوم نے یہ کہکر ٹال دیا کہ " آواز میرا ایک بڑا حربہ ہے اور اس سے مسلمانوں کی کافی خدمت ہوتی ہے اس لئے اس کو خراب کرنا گوارا نہیں " ــــــ نسلی پٹھان تھے۔ قوی ہیکل جسم رکھتے تھے اسی مناسبت سے خوراک بھی کافی تھی لیکن جب سے ان بیماریوں نے آگھیرا تو ناشتہ صرف دو ایک سیب، اور رات کی غذا صرف دودھ یا ایسی ہی کسی ہلکی غذا تک محدود ہو گئی البتہ دوپہر میں پیٹ بھر کھا لیتے تھے لیکن اس کے باوجود جسم بالکل باصحت اور قویٰ بہت اچھے تھے۔

مرحوم اپنی زیست کی آخری سانس تک ملت کی خدمت میں منہمک رہے، ۲۵ جون ۱۹۲۴ء اتوار کے روز دن کے ساڑھے گیارہ بجے آخری تقریر فرمائی، جو سلاست اور حقیقت کی بنا پر اس قابل ہے کہ یہاں درج کی جائے مرحوم نے ایک مدرسہ عربیہ نسوان کا معائنہ فرمایا۔ چھوٹی چھوٹی بچیوں سے صرف و نحو کے بعض سوالات پوچھے، کچھ ترجمہ کروایا اس کے بعد اپنے خاص طرز میں گفتگو شروع فرمائی :۔

" میں تمہاری تعلیم سے بے حد خوش ہوا، اب کچھ نصیحت کے باتیں سن لو، علم کو خدا نے بہت فضیلت دی ہے، قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔ عَلَّمَ اٰدَمَ الاَسْمَاءَ کُلَّھَا ثُمَّ عَرَضَھُمْ عَلَی المَلٰئِکَۃِ فَقَالَ اَنْبِئُوْنِی بِاَسْمَاءِ ھٰؤُلَاءِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ "

اسی طرح حدیث نبوی سے مروی ہے " طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم و مسلمۃٍ "۔ شاید تم کو معلوم ہو گا کہ علم کی دو قسمیں ہیں ایک علم ابدان

اور دوسرا علم دین، علم دین کو دیگر علوم پر فضیلت حاصل ہے، یہ تمہارے سوچنے اور عمل کے طریقوں کو درست بناتا ہے، خدا کا خوف اور سچی محبت سکھاتا ہے، اور روحانی ترقی میں مدد دیتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس کا سیکھنا شروع میں کچھ غیر مانوس سا معلوم ہوگا لیکن کچھ دشوار نہیں، امید کہ آپ ہمت سے کام لیں گی کیا وجہ ہے کہ سات سمندر پار والوں کی زبان سیکھتی ہیں اور آپ کو آجاتی ہے اور عربی زبان جو آپ کے قرآن کی زبان ہے مشکل معلوم ہوتی ہے۔ کوشش کرنے سے کیا کچھ حاصل نہیں ہوتا، اب آپ خود دیکھتی ہیں، مسز صوفی جو حیدرآباد کی لائق ترین خواتین میں سے ہیں، ان کو عربی، فارسی، اردو، انگریزی سب زبانیں آتی ہیں۔

عزیز بیٹیو! مجھے تم سے جو تمنا ہے وہ یہ ہے کہ تم ماں باپ کی اچھی بیٹی بنو، بھائیوں کی اچھی بہن بنو، بچوں کی اچھی ماں بنو، تمہاری گودوں میں قابل قدر قوم پل کر بڑی ہوگی۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک تم پوری طرح اپنے کو اس لائق نہ بناؤ۔

وہ عورت کیا جس کو گھر سے باہر رہنے میں، جلسوں اور کلبوں میں مزہ آئے، ایسی تعلیم سے بہتر ہے وہ تعلیم جو تم کو یہاں دی جا رہی ہے، مجھے تمہاری ترقی دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، امید کہ تم خوب پڑھو گی اور جو پڑھو گی، کہو گی اور یاد رکھو گی اس پر عمل بھی کرو گی۔ وہ علم کیا کہ جس پر عمل نہ کیا جائے۔ یاد رکھو میں تمہیں امام شافعیؒ کا ایک مقولہ سناتا ہوں تم اسے ہمیشہ کے لئے یاد رکھنا۔ ع

"شکوت الی وکیع سوء حفظی ۔ فاوصانی الی ترک المعاصی"

خدا کرے تم اچھی بیٹی، اچھی بہن اور اچھی بیوی بنو، پھر تم ہر قسم کی معاصی کو ترک کردو گی۔ بے جا مذاق معاصی میں داخل ہے، چغلی اور ایک دوسرے کی برائی کرنا معاصی ہیں، دوسرے کا قلم لے لینا، ماں باپ سے بدزبانی کرنا معاصی میں داخل ہے، خدا تو ماں باپ کے بارے میں فرماتا ہے کہ تم انھیں "اُف" تک نہ کہو، اسلئے نافرمانبرداری بھی معصیت ہے، چھوٹوں پر شفقت سے پیش آؤ، بڑوں کی اطاعت اور ادب کرو، جھوٹ اور غیبت سے بچو، سمجھ لو، ترک نماز گناہ ہے ان سب پر عمل کرو ورنہ تمہاری تعلیم بیکار رہے، امید کہ تم دو چار باتوں کو یاد رکھو گی اور عمل کرکے دوسروں کو عمل کی ترغیب دلاؤ گی"۔

قوم کے شفیق باپ کی اپنی بچیوں کے نام یہ آخری وصیت تھی۔ کتنی اثر میں ڈوبی ہوئی اور پر خلوص نصیحت ہے۔

اسی یکشنبہ کی شام کو "بیت الامت" (دولتکدۂ بہادر یار جنگ مرحوم) میں درس اقبال کی محفل تھی، ہمیشہ کی طرح مرحوم بھی شریک رہے، زبان سے اور اپنی ذات سے تشریح اقبال میں معاونت فرماتے رہے، اقبال کی مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کی جلال آفریں نظم "حکمت کلیمی" کا یہ شعر آیا ؎

مرد حق افسون این دیر کہن
از دو حرف ربی الاعلیٰ شکن

شعر کی توضیح ہو چکی تو مرحوم نے فرمایا کہ یہ مقامات جلد گزرنے کے نہیں، آج یہیں ٹھہر جائیں۔ درس ختم ہو گیا، اسی رات مرحوم کو اپنے ایک قدیم دوست جسٹس ہاشم علی خاں کے ہاں دعوت تھی، کسے خبر تھی کہ یہ دراصل دعوت مرگ تھی، بہرکیف مغرب کی نماز پڑھکر مرحوم "بنجارہ ہل" تشریف لے گئے

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اور دیگر اصحاب پہلے ہی پہنچ چکے تھے، کلام اقبال ہی کا تذکرہ تھا، مرحوم اپنے اُن کے انداز میں اس کے محاسن پر روشنی ڈال رہے تھے، کھانے میں کچھ دیر تھی اس لئے ایک حقہ مرحوم کے قریب رکھ دیا گیا، ایک کش بھی لے نہ سکے تھے کہ ایک زبردست جھٹکا محسوس ہوا اور اس کے معاً بعد ایک تشنجی دورہ بھی، ابھی لوگ سنبھالنے بھی نہ پائے تھے کہ یہ مرد حق دیر کہن کے افسوں کو توڑ کر ربی الاعلیٰ سے جا ملا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون سچ ہے "جس سپاہی نے اپنے کو اللہ کے ڈسپلن (اطاعت) کا خوگر بنا لیا تھا، اس کی روح پکار ہونے پر معاً لبیک کیوں نہ کہتی؟ تاخیر اور تامل کی وجہ ایک منٹ کے لئے بھی آخر اسے کیا ہو سکتی تھی؟"

بنجارہ ہل سے نعش "بیت الامت" لائی گئی، تکفین کے بعد لاکھوں کے غمگسار مجمع نے دارالسلام کے وسیع میدان میں نماز جنازہ پڑھی اور یہاں سے اپنے محبوب قاید کی نعش کندھوں پر اٹھائے شہر سے چار میل دور مشیر آباد کے ایک گوشہ میں دفن کرنے لے آئے (نور اللہ مرقدہٗ)۔ ؎

"کس کو لاتے ہیں بہر دفن کے قبر
ہمہ تن چشم انتظار ہے آج"

خوش نصیب قبر خوش ہو کہ تجھ میں آرام پانے کے لئے اللہ کے دین کا دلیر اور باہمت سپاہی آ رہا ہے، وہ غریبوں کا سہارا تھا بیکسوں کا والی تھا ملت کا پشت پناہ تھا"۔——(صدق)

جس وقت جنازہ بیت الامت سے اٹھا ہے تو لوگوں نے دیکھا اور انتہائی تعجب سے دیکھا کہ پچاسوں بیوائیں، سیکڑوں بے یار و مددگار روتے روتے نیم مردہ ہو چلے تھے اور ان کی سسکیوں کے ساتھ اگر کوئی آواز آتی تھی

تو یہی کہ "اب ہم کس کے سہارے جئیں؟" لوگ سمجھتے تھے کہ بہادر خاں کی داد و دہشت مجلس اتحاد المسلمین یا لیگ کے فنڈ ہی تک محدود تھی، آج یہ بھید کھلا کہ خفیہ ہاتھ سیکڑوں کا سہارا بنا ہوا تھا، عجیب بات ہے کہ چار میل کی طویل مسافت بھر بہادر خاں کے جنازہ جن کندھوں پر سلطے کی وہ غریبوں ہی کے کندھے تھے، یہ عزیب اس غریب نواز کی نعش سے کچھ اس طرح پلٹے رہے کہ دوسروں کو ہاتھ لگانے کا موقع ہی نہ دیا، کیوں نہ ہو مرحوم کو غریبوں سے بڑا اُنس اور خاص دلچسپی تھی۔

**موت یا شہادت** غرض ۴ رجب ۱۳۶۳ھ شب دوشنبہ وہ مبارک ساعت تھی، محمد بہادر خاں کے حق میں، جبکہ ان کی بے تاب روح ہمیشہ کے لئے مطمئن ہو گئی۔ لیکن آہ ثم آہ، کتنی الم انگیز اور روح فرسا تھی یہ رات مسلمانانِ ہند کے حق میں جبکہ ان سے اُن کا حقیقی میرِ کارواں چھن گیا، ان کی متاعِ عزیز لٹ گئی۔ ع

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا

ہر طرف سے غل اُٹھا، ایک شور برپا ہوا کہ یہ موت تھی یا شہادت؟ واقعی یکایک حرکت قلب رُک گئی یا اس کے سامان فراہم کئے گئے؟ حکومت نے تحقیق کی، کچھ دنوں بعد اعلان کیا کہ قلب کی حرکت ہی رک گئی تھی اور کوئی بات نہ تھی، اگر حقیقت یہی ہے تو کیا اس سے بہادر خاں کی شہادت میں شبہ پیدا ہوتا ہے؟ کیا اس شخص کی شہادت پر حدیث شریف شاہد نہیں جو طلب علم میں جان دیدے؟ کیا بہادر خاں کی آخری سانس تک علمی مشغولیت اپنے کسی نفع کے لئے، شہرت و عظمت کے لئے یا محض تعیش دماغ کی خاطر تھی؟ کیا انھوں نے سیاست کا اشتراکیت کا مطالعہ اس سے قبل بھی کیا تھا جب کہ اس کی ضرورت نہ تھی؟ اگر یہ سب تھا تو

پیران کی شہادت میں کیوں شبہ کیا جائے، اور بقول ایک عارف کے تلوار کا مارا ہوا تو شہید کہلائے اور جو تیغ عشق سے کبھی کا شہید ہو چکا اس کی شہادت مشکوک ٹھیرے؟[1]

بہرحال یہ تو واقعہ وصال ہوا، ویسے ہفتہ عشرہ ہی سے انداز بدل چکے تھے، گھر میں اور باہر جس سے بھی گفتگو فرماتے تو اسی انداز کی کہ "اب ہمارا کیا ہے!" لیکن کس کا داہمہ رہبری کر سکتا تھا کہ واقعی اب یہ ناسوت کی بندشوں سے آزاد ہونے والے ہیں، وطن اصلی کی یاد اب اس "دام گہ مجاز" سے نکال لیجانا چاہتی ہے۔ ٹاؤن ہال میں سال نو کا جشن وصال سے چار پانچ روز قبل ہی تو ہوا، ہمیشہ کی طرح بڑی حقایق پرور اور جلال آفریں تقریر فرمائی اور آخر میں شاہ دکن کے لئے بڑے ہی پر اثر لہجہ میں دعا فرمائی اور ہزاروں کے مجمع میں سنا دیا کہ "میر عثمان علی خاں کے لئے یہ ہماری آخری دعا ہے" ——— یہ سب ہوا لیکن کسی کو گمان بھی نہ ہوا، اور کیسے ہو سکتا تھا، کہ ان الفاظ میں لغوی حقیقت پنہاں تھی ——— افسوس ہزار افسوس اسلامی "مرد مومن" کی عملی تصویر مٹ گئی، جمال الدین افغانی کے عزائم، محمد علی کے عمل اور اقبال کی بصیرت کا جامع پیکر اٹھ گیا، مسلمانان ہند کا جہاز گرداب میں ڈگمگا رہا تھا، مرحوم نے خضر راہ بن کر اسے ساحل سے ہمکنار کرنے کی کامیاب کوشش فرمائی مگر وائے بدبختی ———

---

[1] ویسے مرحوم کی شہادت کے لئے تو قرآن مجید کی یہ نص بالکل کافی ہے۔
والذین آمنوا باللہ ورسلہ اولئک ھم الصدیقون والشھدآء عند ربھم (سورۃ الحدید۔ آیت ۱۹)۔

قسمت تو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی ہے کمند
دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گیا

**حیات نو کی بشارت** جس رات مرحوم نے وصال فرمایا، بہت سے صاحبدل اور نیک بزرگوں کو مختلف بشارتیں ہوئیں اور بعد میں بھی ہوتی رہیں، صرف ایک بشارت یہاں نقل کی جاتی ہے۔

امجد حیدرآبادی (مشہور صوفی منش رباعی گو شاعر) نے خواب میں دیکھا کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں اور آپ کے دونوں جانب حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت فاروق اعظمؓ تشریف رکھتے ہیں، ایسے میں ایک جنازہ پیش ہوا، صحابہ نے عرض کیا "حضورؐ یہ کس کا جنازہ ہے؟" ارشاد ہوا:۔

"یہ میرے حبیب محمد بہادر خاں کا ہے" ــــــ اس کے بعد اور کچھ تعریف کے الفاظ نطق نبویؐ سے نکل رہے تھے کہ امجد صاحب کی آنکھ کھل گئی ــــــ اللہ اللہ کیا شرف ہے اور ابدی زندگی کی کیسی روشن صبح ہے! ــــــ

محمد بہادر خاں کا عشق نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں مچلنا، تڑپنا رائگاں نہ گیا خوب داد ملی اور یقین ہے کہ جو بھی یہ شیوہ اختیار کریگا، اس کو ایسا ہی اجر ملے گا، انسان آزما کے دیکھے تو پتہ چلے کہ ادھر سے صرف ایک قدم بڑھنے کی ضرورت ہے، رحمت خود دوڑی چلی آتی ہے ــــــ سچ فرمایا:۔

وہ چشم محبت تو جویانِ محبت ہے
دیکھے تو ذرا کرکے اس سے کوئی یارانہ

(صاحب "معارف" مدظلہٗ)

# دِلوں کی حکمرانی

حدیث شریف کے الفاظ بہت واضح ہیں، مقبولیت لی نہیں جاتی بلکہ اللہ کی طرف سے عطا کی جاتی ہے، جو بندے اللہ تعالیٰ کی رضا میں اپنی مرضی گم کر دیتے ہیں تو اللہ میاں بھی ان سے راضی ہو جاتے ہیں، اور اپنی اس رضامندی کا اعلان بھی فرما دیتے ہیں۔ ——— دو جہاں کے سردار (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک طویل حدیث ارشاد فرمائی جس کا مفہوم یہ ہے کہ جب کسی بندے سے اللہ تعالیٰ راضی ہو جاتے ہیں تو فرشتوں میں اپنی رضامندی کا اعلان فرما دیتے ہیں اور پھر فرشتے روئے زمین پر یہ منادی عام کر دیتے ہیں اس طرح لوگوں میں اس شخص کی مقبولیت بڑھنے لگتی ہے۔

(دیکھو بخاری بہ روایت حضرت ابو ہریرہ رضؓ)۔

ویسے تو مرحوم کی پوری زندگی میں اس مقبولیت کے سیکڑوں ثبوت ملتے رہے لیکن اس کا سب سے بڑا مظاہرہ اس وقت ہوا جبکہ وہ لاہوت کی طرف کوچ کر چکے تھے ـــــ شہر کے سارے ہندو اور مسلمان تو ایک طرف رہے، اضلاع اور تعلقات سے کثیر تعداد میں مسلمان موٹروں اور ریلوں کے ذریعہ آپہنچے، بڑے بڈھے جنھوں نے شاہی جنازے بھی دیکھے ہیں اور بادشاہوں کی تخت نشینی کی خوشیاں بھی منائی ہیں سب کو یہی کہتے سنا گیا کہ "ہم نے آج تک خوشی کا نہ غمی کا کوئی اتنا زبردست اجتماع دیکھا" جدھر دیکھو لوگ چیونٹیوں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں، ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد، امیر غریب، عالم، غیر عالم ـــــ جب سواری شاہانہ "بیت الامت" آرہی تھی تو بڑی مشکل سے اتنی جگہ کر دی گئی کہ ایک موٹر گزر سکے اور تقریباً نصف میل کا فاصلہ موٹر کو اسی تنگی میں سے طے کرنا پڑا، یہ تو صرف ایک راستہ کا عالم تھا جو سب سے زیادہ وسیع ہے، بیت الامت کے ارد گرد کوئی راستہ دور دور تک کھلا نہ تھا ـــــ خسرو دکن نے اس پروانہ وار اجتماع کو دیکھا تو ان کے قلب پر ایک خاص اثر ہوا اور زبان اس کے اظہار سے نہ رک سکی، فرمایا :-

"یہ مسلمانوں کے قلوب کے بادشاہ تھے"

موت کے وقت کا یہ منظر یکایک تو ہو نہیں گیا، مرحوم کو زندگی میں بھی اس نعمت سے پوری طرح سرفراز فرمایا گیا، شاید ہی اتنی کم مدت میں کسی اور کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی ہو، باوجود انکار کرتے رہنے کے مجلس اتحاد المسلمین اور آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کی صدارت پر ہر بار بلا اختلاف نامزد ہونا، مسلم لیگ کی عرفی نہ سہی معنوی قیادت اس شان سے کرتے رہنا، مقبولیت کی دلیل نہیں تو اور کیا ہے؟ اور کیا یہ سب محض خطابت کی سحر کاری تھی؟

کیا اس وقت ہندوستان ابو الکلاموں اور ابو البیانوں سے یکسر خالی ہو گیا تھا؟
——— یہ صحیح ہے کہ سحر بیانی نے جذب دروں سے ملکر سونے پر سہاگہ کا کام کیا
لیکن اگر تڑپتا ہوا دل، روتی ہوئی آنکھ، سجدے کرتی ہوئی پیشانی نہ ہوتی،
خدا پرستی للہیت کی بُو ہی نہ ہوتی تو لفاظی کی ہوا لاکھ چلا کرتی، گلستانِ ہند خوشبو
سے کیونکر مہک اٹھتا؟ اور ہر عالم سے عامی تک اس عطر بیزی کی داد کیسے
دیتا؟ ——— راقم سوانح نے خود برطانوی ہند کے مسلمانوں کو یہ کہتے سُنا،
اور انتہائی جوش کے ساتھ کہتے سنا کہ:۔

"قائد اعظم یقیناً ہمارے سیاسی رہنما ہیں اور بڑی اچھی
قیادت کر رہے ہیں لیکن حقیقی معنوں میں مسلمانوں کا کوئی
قائد، ہر پہلو سے ہو سکتا ہے تو وہ بہادر یار جنگ کی ذات ہے
کیونکہ یہاں مذہب و سیاست کی جامعیت اور ہر حال میں
مذہب کا غلبہ نمایاں ہے"

اس پر بھی جن کو یقین نہیں آتا کہ قائد ملت ؒ کی یہ
مقبولیت خداداد نہ تھی بلکہ محض خطابت کا نتیجہ تھی۔

وہ ان کی اس زندگی پر نظر دوڑائیں جبکہ وہ مشہور خطیب تھے، نہ "قائد ملت"
بنے تھے ——— بلاد اسلامیہ کا سفر مرحوم کے لئے بالکل نیا، اور مرحوم کی ذات
ان مقامات کے لئے بالکل اجنبی، پھر مرحوم کی حیثیت کسی سرکاری قونصل یا
سفیر کی نہیں بلکہ تمام تر خانگی ہی تھی، لیکن اس کے باوجود مرحوم فرماتے تھے کہ:۔

"چونکہ اللہ رسول کا ذکر ہمیشہ ہی ہوتا رہتا تھا، لوگ مجھ سے ایسی
خوش فہمی سے ملتے تھے اور میری ایسی عزت و خدمت کرتے تھے جیسے کوئی
مرید اپنے مرشد کی کرتا ہو" ———

دورانِ سیاحت مرحوم خود کو بہت گمنام رکھنے کی کوشش کرتے رہے لیکن ہر جگہ ان کی شہرت ہوتی گئی، مصر میں نحاس پاشا سے بالکل خانگی گفتگو فرما رہے تھے، خبر بھی نہ تھی کہ پریس والے وہاں آموجود ہوں گے، لیکن انتہائی تعجب ہوا کہ دوسرے روز اخباروں میں مرحوم کا فوٹو (تصویر) بھی چھپا اور ایک مستقل مضمون بھی جس میں ان کی عربی دانی اور قابلیت کی تحسین کی گئی تھی، اب کیا تھا لوگوں نے ستانا شروع کیا، ملنے والوں سے تانتا توڑائے نہ ٹوٹتا تھا مرحوم یہاں سے بھاگ کر شام آپہنچے، دو ایک روز بھی گمنامی میں نہ گذارنے پائے تھے کہ لوگوں نے ان کی صورت کو غور سے دیکھنا شروع کیا، آخر ایک شخص نے مصر کا وہ اخبار نکالا جس میں مرحوم کی تصویر چھپی تھی اور اس طرح یہاں بھی کافی شہرت ہو گئی ——— یہی مقبولیت دوسرے مقامات پر بھی حاصل رہی، بلکہ یہاں تو اخبار شہرت کا باعث بنے دوسرے مقامات پر صرف مرحوم کی ذاتی خصوصیات، سحر کلامی اور جادو بیانی ہنیں بلکہ قلب کی نورانیت اور کشش جو ہر آن چہرہ بشرہ سے جھلکتی رہتی تھی اور ہر دیکھنے والے کو گھائل کر دیتی تھی۔

اس خصوصیت کے علاوہ مرحوم کو ایک اور صفت سے بھی سرفراز فرمایا گیا تھا، اور یہ صفت ان کا انداز گفتگو تھی، اجنبی تو اجنبی ہی ٹھیرا، دشمن بھی سامنے آتا تو مرحوم کے دو ایک جملے اسیر جادو کا اثر کر جاتے، مرحوم کے ہواخواہ گو بہت زیادہ تھے لیکن دشمنوں کی تعداد بھی کم نہ تھی، لیکن ہر ایک دشمنی خفیہ ہوتی، بعضوں کو ان کے علم میں کلام تھا، بعض ان کی سیاست دانی کے قائل نہ تھے، بعض عمداً ان کے عمل کی نفی کرتے تھے، لیکن جب سامنے آتے تو سب ان کو قائد ہی سمجھتے اور سمجھنے پر مجبور ہوتے تھے، اس صفت سے مرحوم نے

کافی فایدہ بھی اٹھایا اور اپنے مخالفین سے اپنی مرضی کے مطابق کام کروائے ان کی مخالفت عمل میں ظاہر نہ ہو سکی ــــ حیدر آباد کے ایک مشہور ہندو لیڈر مسٹر وینکٹ راؤ کے الفاظ سنئے :-

"ایک نظر بھر کر جسے دیکھا اسے رام کیا، ہنستے تو دل موہ لیتے، بات کرتے تو خلوص کا یہ عالم کہ ایسا معلوم ہوتا گویا کوئی فرشتہ سچ مچ انسان کے بھیس میں زمین پر آگیا ہے، ہزاروں بیوائیں، سیکڑوں یتیم بیسیوں بے خانماں برباد ان کی سرپرستی میں روٹی کھا رہے تھے، آہ ان کا اب کیا ہوگا" ــــ (قائد ملت نمبر اخبار تنظیم)

یہ تو دنیاداروں میں مقبولیت کا ذکر ہوا، خالص دیندار، گوشہ نشین اور اللہ کے صالح بندوں میں بھی ان کی بڑی وقعت تھی جس کسی نے ان کے انتقال کی خبر سنی انتہائی تاسف کا اظہار کیا، کسی کے آنسو نکل پڑے کوئی آہ بھر کر چپ ہو گیا، ہر ایک نے ان کے خلوص، صداقت اور عشق رسول کی تصدیق کی، ان کی للہیت اور جامع شخصیت کا اعتراف کیا اور یہی فرمایا کہ "ایسا شخص اب مشکل ہی سے پیدا ہوگا" ــــ جو ہستیاں عام لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہیں ان کے نام گنوانا فضول ہے، وقت کے مشہور عالم اور صاحب دل، صاحب "صدق" کے الفاظ مرحوم کی اس عظمت کے اظہار کے لئے بہت کافی ہیں حضرت مولانا عبدالماجد جیسے محتاط کے الفاظ ہیں، تصنع کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا :-

"موت کا سوچ اکثر آتا ہی رہتا ہے، ابھی کل کی بات ہے کہ سوچتے سوچتے خیال آیا کہ موت آج ہی کل میں اگر آگئی تو

نماز جنازہ کس سے پڑھوانے کو دل چاہتا ہے؟ کئی ایک نام ذہن میں آئے لیکن سب سے پہلا جو نام ذہن میں آیا وہ اسی مجاہد اِسلام بہادر خاں حیدر آبادی کا تھا! کاش بہادر یار جنگ دورہ کرتے، پھرتے پھراتے عین اس وقت اِتفاق سے لکھنو آموجود ہوتے! ایسا کیوں ہونے لگا، لیکن دل کی کشش سے ایسا ہو جانا کچھ ناممکن بھی نہیں! ——— یہ تھی اس نامہ سیاہ کے دل میں پیرِ دلِ مجاہد ملت کی محبت اور عقیدت!

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

یہ مقبولیت کیا کبھی ہوتی ہے؟ دلوں کی یہ حکمرانی کیا انسانی بس کی بات ہے؟ مرحوم کے بعض مداح تو وہ بزرگ بھی ہیں جنھوں نے کبھی ان کی ایک تقریر بھی نہیں سنی البتہ ان کے اندرون سے خوب واقف تھے، ذالك فضل الله يوتيه من يشاء۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

# ظاہر و باطن کی جامعیت

حلیہ — صحیح تنومند جسم، خوبصورت اور دلفریب قد بالا، سرخ و سفید رنگ، متبسم کتابی چہرہ جس سے افغانیت کا دبدبہ اور مذہبیت کا نور نمایاں، گرد خشخشی مگر بھری ہوئی ڈاڑھی اور ترشی ہوئی مونچھیں، دمکتی ہوئی پیشانی جس سے اقبالمندی ظاہر، پرنور نرگسی آنکھیں جن سے ذہانت، متانت، محبت اور شفقت عیاں ——— پنجہ خوب مضبوط مگر انگلیاں متناسب اور نکیلی جو جفاکشی، قوت تحریر و تقریر پر شاہد، پیر سپاہیانہ اور رفتار پُر شوکت۔

عموماً شیروانی اور سرخ ترکی ٹوپی میں ملبوس رہتے، لیکن موسم گرما میں انگرکھا بھی پہن لیتے اور سرما میں عمامہ بھی باندھ لیا کرتے تھے اور کبھی کبھی جناح کیپ بھی استعمال کرتے تھے، ہر لباس ویسا ہی

بھلا معلوم ہوتا ـــــــ در اصل لباس سے ان کی زینت نہ تھی بلکہ لباس کو ان سے شرف تھا۔

مرحوم قاید ملت پر خدا کی عجیب عنایتیں تھیں، جتنی اعلیٰ سیرت عطا ہوئی، اتنی ہی اچھی صورت سے بھی نوازا گیا، جتنا پر عظمت باطن عنایت کیا گیا، اتنا ہی پر شکوہ ظاہر بھی دیا گیا ـــــــ ہزاروں کے مجمع میں ان کی شخصیت اپنی خاص آن کی وجہ سے نمایاں رہتی، بشرہ اتنی ہمہ گیر کیفیات کا مظہر تھا کہ مفکرین میں ہوتے تو تفکر کی اعلیٰ ترین علامتیں یہیں پڑھی جا سکتی تھیں، پاکبازوں کے گروہ میں ہوتے تو جمال رحمانی کے زیادہ آثار یہیں جلوہ گر رہتے۔ "خاکساروں" اور "رضاکاروں" کے درمیان ہوتے تو جفاکشی اور عسکریت کا جلال اسی چہرہ پر زیادہ نمایاں رہتا، خطیب کی حیثیت سے ظاہر ہوتے تو انہیں کے چشم و ابرو، اپنے الفاظ کی سب سے زیادہ وضاحت، اور اپنے کنایات کی سب سے بڑھکر تشریح کرتے دکھائی دیتے ـــــــ حقیقت بھی یہی تھی، جو چیزیں ظاہر تھیں وہ اصلیت سے خالی نہ تھیں، اگر اندر یہ سب کچھ نہ ہوتا تو باہر بھی دکھائی نہ دیتا کیونکہ ظاہر باطن ہی کا تو آئینہ دار ہوتا ہے۔

**دماغی صلاحیتیں**

مطالعہ کی وسعت تو انسان کے بس کی بات ہے۔ لیکن اس سے پورا پورا استفادہ اور افادہ ہر ایک کے اختیار میں نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ مطالعہ کا تعلق اپنی محنت و جانفشانی سے ہے لیکن اس سے حقیقی فایدہ اٹھانا اور دوسروں کو بہرہ ور کرنا تمام تر دماغی صلاحیتوں پر منحصر ہے اور دماغی خوبیاں عطیہ ہوتی ہیں اسی غیر اختیاری شئے کی وجہ سے ایک بہت پڑھا لکھا پروفیسر بھی بعض دفعہ ناکام ثابت ہوتا ہے

اور ایک نسبتاً کم مطالعہ استاد، شاگردوں کے حق میں اس سے زیادہ مفید پایا جاتا ہے ـــــ بعض لوگ صلاحیت رکھتے ہیں لیکن مطالعہ کی کمی ہوتی ہے، بعض پڑھتے بہت ہیں لیکن اس علمیۂ ربانی سے محروم رہتے ہیں، وہ بڑا ہی خوش نصیب انسان ہے جس میں یہ دونوں صفات جمع ہوتے ہیں، مرحوم محمد بہادر خاں ایسے ہی خوش قسمت افراد کی ایک اعلیٰ ترین مثال تھے ؛

درستی تعلیم جتنی کچھ ہوئی یا ہوسکی اس کا حال معلوم ہی ہوچکا، اس کے بعد جو کچھ خانگی طور پر اساتذہ سے پڑھا اور اپنے طور پر معلومات بڑھائیں وہ بہرحال اتنی تو نہ تھیں کہ سب علماء و ماہرین سے زیادہ ہوں لیکن پھر کیا بات تھی کہ ان کی تقریروں اور گفتگو سے وہ علمیت ٹپکتی تھی جو عام طور پر اوروں کے پاس پائی نہیں جاتی! مثل مشہور ہے کہ "یک من علم را دہ من عقل باید" ـــــ دراصل یہاں جتنا علم تھا اس سے زیادہ اس سے نفع اٹھانے اور نفع پہنچانے کی صلاحیت تھی اور غیر معمولی صلاحیت تھی۔

مرحوم کی چند خاص دماغی خوبیاں تھیں، جو بہت کم ایک جگہ پائی جاتی ہیں، ان کا حافظہ نہایت قوی تھا، جب ایک دفعہ کوئی کتاب نظر سے گذر چکتی تو برسوں نہ بھولتے تھے، یہی وجہ تھی کہ تاریخ اسلام کا مطالعہ چھوٹے ایک عرصہ ہوچکا تھا لیکن اب بھی جب واقعات بیان کرتے اور کتابوں کے حوالے دینے لگتے تو سننے والوں کی عقل دنگ رہ جاتی، حافظہ کی یہ خوبی مرحوم کے لئے نعمت غیر مترقبہ تھی، کیونکہ سیاسی انجمنوں اور کام کی کثرت ان کو کوئی کتاب ایک سے زیادہ مرتبہ پڑھنے کا موقع مشکل ہی سے دیتی تھی۔ دوران تقریر اقبال کے خصوصاً اور رومی، جامی، داغ، غالب، ذوق وغیرہ کے اشعار عموماً جس آسانی اور برجستگی کے ساتھ مرحوم کی زبان پر رواں ہوتے تھے

اس کا اصلی سبب ان کی غیر معمولی قوت حافظہ ہی تھا، اس کم یاب صفت سے مرحوم کو یہ بھی فایدہ حاصل ہوا کہ جب وہ کسی شخص کو ایک بار دیکھ لیتے اور اس کا نام پوچھ لیتے تو پھر چاہے کتنی ہی مدت بعد اس سے ملاقات ہوتی ایسا پہچان جاتے گویا روزمرہ کا ملاقاتی ہے، حیدرآباد کے گوشہ گوشہ میں اور ہندوستان کے طول و عرض میں ان کو بار بار پھرنا پڑتا، جب یہ ایک آدھ مرتبہ کی شناسائی پر لوگوں سے قدیم ملاقاتیوں کی طرح ملتے تو ان کے قلوب مسخر ہو جاتے، اور وہ یہ سمجھنے لگتے کہ مرحوم کو ان کا بڑا خیال ہے اور بہت چاہتے ہیں، مرحوم کی عادت تھی کہ جب ایسے کسی شخص سے ملتے تو "السلام علیکم" کے ساتھ ہی اس کا نام لیتے اور وہ رام ہو جاتا۔

دوسری خصوصیت یہ تھی کہ دماغ بڑا "اخاذ" پایا تھا۔ موٹی موٹی کتابیں جب پڑھ چکتے تو بڑی آسانی سے ان کا اصل منشا اور روح ان کے ذہن میں آجاتی، دماغ کا یہ خاصہ اتنا گراں قدر ہے کہ اس کے بغیر کوئی آدمی میدان سیاست میں قدم رکھکر کامیابی سے چل بھی نہیں سکتا، اس صفت نے حافظہ کی خوبی کے ساتھ ملکر ایک نادر کیفیت پیدا کر دی تھی، برسوں پہلے پڑھی ہوئی کتابوں کا ذکر آتا تو ان کا خلاصہ بیان کرنا یا ان کے مرکزی نکات بتا دینا مرحوم کے لئے ایک آسان بات تھی —— "دارالسلام" میں ایک بار تقریری مقابلہ تھا، چند کتابیں سیرت اور تاریخ اسلام سے متعلق انعام کے لئے لائی گئی تھیں، قاید ملت صدارت فرما رہے تھے، کتابوں پر جو نظر پڑی تو فرمایا بہت اچھا انتخاب ہے، یہ کتابیں بارہ سال قبل میری نظر سے گزر چکی ہیں، اور پھر ہر ایک کتاب کا نام لے کر فرمانے لگے کہ اس کی فلاں فلاں بات خوب یاد رکھنے کے قابل ہے، ہم لوگ اس گفتگو سے دنگ رہ گئے —— سیاسیات کی بھول بھلیاں

بھی کوئی معمولی ہوتی ہیں؟ اقتدار اعلیٰ کے مسائل، طرزِ حکمرانی کے مختلف نظریے قانون کی قسمیں غرض کونسے مسائل ہیں جو بغیر کافی غور و فکر کئے سمجھ میں آجاتے ہیں؟ معاشیات میں بنکنگ، کرنسی اور دوسرے مالیاتی مسائل کیا ہر پڑھے لکھے کی سمجھ میں آسکتے ہیں؟ اور اگر کوئی سمجھ بھی لے تو کیا ان مسائل کی تفہیم اس کے لئے ممکن بھی ہے؟ لیکن مرحوم نے ایسا "اخاذ" دماغ پایا تھا کہ مشکل سے مشکل کتاب، پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل پڑھتے تو اس آسانی و خوبی سے اس کی حقیقت سے آگاہ ہوجاتے کہ حیرت ہونے لگتی اور پھر ان کے لئے سمجھنا اور سمجھانا دو الگ الگ باتیں تو تھی ہی نہیں! ——— ایک واقعہ یاد آیا، مولوی احمد خاں صاحب ایم، اے (عثمانیہ) ال، ال، بی (علیگ) معاشیات کے چند معیاری طلبا میں سے ہیں، موصوف نے اپنا ایک کتابچہ (پمفلٹ) "ہندوستانی زر کے مسائل" نواب صاحب کی خدمت میں پیش کیا اور چلے گئے، چند روز بعد پھر ملاقات کا شرف حاصل ہوا تو مرحوم نے خانصاحب کی تعریف فرمائی، ان کی تفہیم کی داد دی اور بعض پیچیدہ مسائلِ زر پر اس طرح گفت گو فرمانے لگے جیسے کوئی ماہرِ فن بحث کرتا ہے، خانصاحب کی یہ کتاب ان کی کافی دیدہ ریزی اور دقت نظری کا نتیجہ تھی، اور واقعی زر کے مسائل ہوتے بھی ایسے ہی اَدق ہیں، لیکن مرحوم کی اس طرح بلا تکلف بحث سے خاں صاحب ساکت ہوکر رہ گئے۔

یہ تو ایک فن دان سے گفتگو کا ذکر ہوا، عوام کے مجمعوں میں سیاسیات اور معاشیات کی باریک گرہیں اس طرح کھولتے کہ جاننے والے انگشت بہ دندان رہ جاتے اور عوام اپنی بساط کے موافق سمجھ جاتے، "تشریح اصلاحات" "اشتراکیت" اور "اِسلام" اور حیدرآبادی اور ہندوستانی سیاست پر

بے شمار تقریریں مرحوم کی اس خوبی کی آئینہ دار ہیں، اور اس ہنر کا گر یہی تھا کہ قوت آخذہ بلا کی موجود تھی، ہر بات کی کنہ تک اور ہر واقعہ کی علت تک بہت جلد اور بڑی آسانی سے پہنچ جاتے تھے، اور چونکہ ان کے لئے یہ چیز بالکل سہل تھی اس لئے جب تقریر کے پیرایہ میں ظاہر ہوتی تو وہی سلیس و آسان بن جاتی!

لیکن غور سے دیکھا جائے تو "قوت آخذہ" ذاتی تفہیم کے لئے تو کافی ہے لیکن اَخذ کردہ چیزوں کو مربوط شکل میں پیش کرنے کے لئے ایک اور خوبی کی ضرورت ہے، اور وہ ہے "تحلیلی صلاحیت" Analytical copecity ــــ عموماً عوام اور خصوصاً مقررین اپنے اظہار خیال میں اس وجہ سے بھی کچے ہوتے ہیں کہ ان کا دماغ خیالات کی صحیح تحلیل نہیں کر سکتا، جب دماغ میں خیالات غیر مربوط اور غیر تحلیل شدہ ہوں تو اظہار میں بھی الجھاؤ کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہے ــــ مرحوم کے دماغ کا تیسرا خاص وصف "تحلیلی صلاحیت" تھی ــــ کسی عالمانہ تقریر یا حکیمانہ کتاب میں ایک دو باتیں ہی محفوظ کرلے کے لائق نہیں ہوتیں بلکہ کئی مسائل اور بیسیوں خیالات ہوتے ہیں، عالم یا حکیم اپنی تقریر و تصنیف میں چونکہ شرح و بسط کے ساتھ ہر مسئلہ کی وضاحت کرتا ہے اس لئے اس کا مافی الضمیر واضح ہو جائے تو تعجب کی کونسی بات ہے؟ لیکن جب اِس تفصیل کا اجمال چند جملوں اور فقروں میں بیان کرنا ہو اور یہ شرط رہے کہ نہ اس کا وزن گرے، نہ منشاء فوت ہو تو اچھے اچھوں کی پیشانی پر بھی بل آجاتے ہیں، اِس کام کے لئے تحلیلی دماغ Anolytic Mind اِنتہائی ضروری ہے ــــ مرحوم میں یہ وصف کامل طور پر موجود تھا، تقریر یا تحریر کے وسیع گلبن سے دو چار پھول ایسے چن لیتے جن سے اس کی رونق تھی اور ان کو ایک دلکش گلدستہ کی شکل میں پیش کر دیتے کہ

ہر ایک دماغ معطر ہونے لگتا، دو، دو گھنٹوں کی تقریروں کا پانچ دس منٹ میں لب لباب بیان کرنا، مرحوم کے لئے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ ــــــ مولانا آزاد سبحانی ہندوستان کے مشہور فلسفی اور دقیق مقرر ہیں، ایک مرتبہ حیدرآباد تشریف لائے مرحوم ہی کے ہاں قیام رہا، مرحوم نے مولانائے موصوف کی تقریر کا انتظام کروایا ایک کثیر اجتماع میں مولانا نے "وجود باری" پر اپنے انداز کی تقریباً ڈھائی گھنٹہ تقریر فرمائی، فلسفی اور پھر ایسا عنوان، خوب توضیح ہوئی، کافی تشریح کی گئی لیکن پھر بھی سوائے چند اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کے سب سمجھنے سے عاری رہے، تقریر ختم ہوئی تو مرحوم صدر جلسہ کی حیثیت سے اُٹھے اور فرمایا "میں پٹھان آدمی، فلسفہ سے مجھے کیا تعلق ہو سکتا ہے، میرے پاس دماغ نہیں صرف ایک تڑپتا ہوا دل ہے"۔ اس کے بعد فرمانے لگے "مولانا کی تقریر بہت معلومات آفریں تھی، منشا یہ تھا ....... " کہہ کر تقریباً ۵ منٹ میں "وجود باری" کی ایسی عام فہم اور مدلل توضیح فرمائی کہ عالم و عامی ہر ایک کو لطف آکر رہا، پھر کوئی بات اپنی طرف سے بیان نہیں کی گئی مولانا ہی کی تقریر کا خلاصہ اور انھیں کی مثالوں کا آسان پیرایہ میں اعادہ ہوا ــــــ اور تو اور خود مولانائے موصوف جھومتے جاتے تھے اور بیخودی کے عالم میں ہاتھ پٹک پٹک کر تحسین و آفریں فرما رہے تھے ــــــ یہ کیا چیز تھی؟ زورِ کلام کو چھوڑتے ہوئے اصل سبب وہی خیالات کا تجزیہ اور ان کا ترتیب کے ساتھ بیان، جس سے وقت کی بچت ہوتی ہے، مفہوم کھل جاتا ہے ــــــ اسی دماغی صلاحیت کی وجہ سے مرحوم کا تبصرہ ہر مقرر کی تقریر سے اور ہر مصنف کی تصنیف سے وزنی، سلجھا ہوا اور قابل قدر ہوتا تھا۔

اِن صفات عالیہ کے سوا، ایک اور دماغی خصوصیت بھی تھی جو ہر آن

عمل سے ظاہر تھی، اس کو "قوت فکر" سے تعبیر کیجیے یا "تدبر" کہیے، بہرحال اسی کی وجہ سے مرحوم میدانِ سیاست کے ایک اعلیٰ شہسوار بن سکے، مرحوم کی فکر بہت عمیق اور صحیح ہوا کرتی تھی، حیدرآباد کو مرہٹوں کی یورش اور کانگریس کی عیاریوں سے بچانے کے لئے مرحوم نے جو جو گُر بنائے وہ ان کی فکری قوت کے ترجمان ہیں، ہندوستان کے مشہور ترین سیاس اور دنیا کے مسلمہ مفکر اور مرحوم کے محبت آمیز الفاظ میں "گرگ باران دیدہ" محمد علی جناح نے تک مرحوم کے اس وصف کی داد دی اور اعتراف فرمایا کہ "بڑے بڑے نازک مواقع پر نواب صاحب میرے لئے معین ور ہبر ثابت ہوئے ہیں" ــــــ یہ مرحوم کے قوت فکر کی پختگی ہی تھی جس نے ان کی سیاست کے دامن کو غلط اقدام اور پسپائی کے داغ سے پاک رکھا، اس اعتبار سے مرحوم کا دامن مولانا محمد علیؒ سے زیادہ صاف ہے

افسوس اور ہزار افسوس کہ مرحوم کو اپنی ان دماغی صلاحیتوں کا مستقل تحریری شکل میں کوئی نتیجہ چھوڑنے کا موقع نہ ملا، ورنہ یقین تھا کہ جس کسی موضوع پر وہ قلم اٹھاتے جس کسی مسئلہ کی توضیح کے لئے بیٹھ جاتے، تو لٹریچر میں ضرور ایک گرانمایہ اضافہ ہوتا، "قوت آخذہ" "قوت فکر" "قوت حافظہ" اور "تحلیلی صلاحیت" اس اعلیٰ توازن کے ساتھ بہت کم کسی کے دماغ میں پائی جاتی ہے، اور جہاں یہ خوبیاں اس طرح مجتمع ہوتی ہیں تو ان کا اظہار بھی اتنے ہی شاندار طریقہ پر ہوتا ہے۔

**وسیع مطالعہ** یہ بتایا جاچکا کہ مدرسہ کی ابتدائی تعلیم کے بعد مرحوم نے صرف تفسیر، فقہ، حدیث اور عربی باضابطہ طور پر مولانا شمسی صاحب (صاحب تفسیر شمسی) اور مولوی سعدۃ اللہ صاحب مدرس مدرسہ دارالعلوم سے پڑھی، لیکن علم کے بے پایاں ذوق نے مرحوم کو مختلف علوم سے نہ صرف

روشناس کرایا بلکہ ان پر کافی قدرت بھی عطا کی۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی جو مرحوم کے بچپن کے ساتھی اور قریبی دوست ہیں، ان کی علمیت کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:۔

"مرحوم کی طالب علمانہ زندگی بہت جلد ختم ہوگئی اور وہ ابتدائی عمر ہی میں دنیا کے دھندوں میں پھنس گئے، یہی وجہ ہے کہ وہ علمی اداروں کی باضابطہ تعلیم یا امتحانوں کی کامیابی کی اسناد نہیں رکھتے تھے، لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ علم محض مدرسوں یا کالجوں میں حاصل نہیں ہوتا بلکہ بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ مکتب اور ملا، انسان کی صلاحیتوں کو جو اکتساب علم کے لئے فطرت کی طرف سے ودیعت کی جاتی ہیں، نقصان پہنچاتے ہیں۔ چنانچہ اقبال نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے جب وہ کہتے ہیں:۔

اے کہ در مدرسہ جوئی ادب و دانش و ذوق

نہ خرد بادہ کش از کارگہ شیشہ گراں،

تاریخ عالم میں اور خصوصاً مشرق کی تاریخ میں اکثر علمائے باضابطہ مدرسوں میں نہیں بلکہ محض اپنی ذاتی کوششوں سے علم و فن میں کمال حاصل کیا۔ مولوی محمد بہادر خان مرحوم کا شمار بھی اسی گروہ میں ہوتا ہے، جنھوں نے اپنے فطری ذوق علم کی تشفی خود اپنے طور پر مطالعے سے کی اور علم کی جن شاخوں سے ان کو دلچسپی تھی، ان میں اس قدر ید طولیٰ حاصل کیا کہ باضابطہ اسناد رکھنے والوں سے بدرجہا آگے بڑھ گئے۔ وہ

مطالعہ کرتے تھے، مشاہیر علماء سے بحث کرتے تھے اور خود غور و فکر کرنے کے عادی تھے، اکتساب علم کے یہی تین ضروری اجزا ہیں اور مرحوم ان تینوں سے بہرہ ور تھے۔ ان کا ذاتی کتب خانہ ملک کے معدودے چند کتب خانوں میں سے ہے، جن میں مختلف علوم و فنون کی معیاری اور نایاب کتابیں موجود ہوں۔ انھوں نے ان میں سے اکثر کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور ان کتابوں پر جا بجا ان کے مطالعہ کے نشانات موجود ہیں۔ بلاد اسلامیہ کے سفر میں اور ہندوستان کے متعدد دوروں میں ان کی ملاقات بڑے بڑے علماء سے ہوئی اور اپنی ذکاوت اور ذہن رسا کی بدولت وہ ان علماء کی گفت گو اور بحث مباحثہ سے بہترین طور پر استفادہ کر سکے۔ ان کی قوت فکر کا اظہار ان کی تقریروں اور علمی صحبتوں میں اچھی طرح ہوتا تھا۔ غرض ایک عالم کے لئے جتنی ضروری صفات ہیں وہ ان میں کافی موجود تھیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے مختلف النوع کمالات میں ان کے علمی کمالات کو بھی جگہ دینا لازمی ہے۔

دنیائے اردو کے تو وہ سب سے بڑے خطیب تھے، اس لئے ان کی اردو دانی کا تذکرہ کرنا تحصیل حاصل ہے۔ عربی اور فارسی میں بھی ان کی مہارت مسلمہ تھی، اور تفسیر کا انھوں نے خاص طور پر مطالعہ کیا تھا اور روزانہ فجر کی نماز کے بعد مسجد میں تفسیر کا درس دیا کرتے تھے، تفسیر اور حدیث میں ان کی معلومات جس پائے کی تھیں اس سے وہ لوگ

بخوبی واقف ہیں جو "درس اقبال" میں شرکت کرتے تھے
سچ پوچھئے تو جب درس میں وہ شرکت کرتے تھے، اس کا رنگ
ہی کچھ اور ہوتا تھا، حاضرین ایک کیف و سرور سے سرشار
ہو کر نکلتے تھے، بقول ان کے جب وہ اقبال کے کسی شعر پر
"نمک مرچ لگانا" شروع کرتے اور بات میں بات نکلتی جاتی
تو دنیا بھر کے مختلف مسائل پیش نظر ہو جاتے۔"

(اخبار "تنظیم" قاید ملت نمبر"۔ مولوی بہادر خاں مرحوم و مغفور ایک عالم کی حیثیت سے")
سوائے مذہبی مطالعہ کے مرحوم نے کوئی اور فن اپنی خواہش سے نہیں سیکھا، بلکہ مسلمانوں کی ضروریات ان کو اس فن کے مطالعہ پر مجبور کرتی رہیں اور چونکہ صلاحیتیں بہت اعلیٰ درجہ کی عطا ہوئی تھیں اس لئے جس فن کا رُخ کیا اس میں ماہرانہ رنگ دکھایا، سیاسیات کا مطالعہ تبلیغ مذہب کے زمانے میں بہت کم بلکہ قابل نظر انداز تھا۔ ہاں وید، بھگوت گیتا اور بائبل (انجیل) سے اس وقت بھی خوب واقف تھے، ——— فرماتے تھے کہ کاندھی جی چاہتے ہیں کہ وید (جن کی حقیقت اَب ثابت ہو چکی ہے) ہندوں کے سامنے نہ رہیں بلکہ صرف بھگوت گیتا ہی کے ورد ہوں، بھگوت گیتا میں چونکہ فوجی تربیت اور جہاد وغیرہ سے متعلق مسائل ہیں اس وجہ سے وہ تو ہندوؤں کو پڑھائی جائے لیکن وید مطالعہ میں نہ آنے پائیں۔ مرحوم نے ایک دفعہ پونا میں خود ہندوؤں کی ریسرچ کمیٹی کے کاموں کا معائنہ فرمایا، جہاں اُنھیں بتایا گیا کہ تحقیق سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ وید دراصل افسانے ہیں ——— غرض جب تبلیغ کا میدان چھوٹا اور پھر سیاست کی تیراکی کرنی پڑی تو لازماً مرحوم نے اس فن کے تمام کمالات سیکھے، حتیٰ کہ ایک ممتاز حیثیت حاصل کر لی، پھر جب دیکھا کہ اشتراکیت

کی سموم ہوا، مسلمانوں کے دماغ کو ماؤف کر رہی ہے تو اشتراکیت اور دوسرے معاشی نظاموں کو گہری نظر سے دیکھا، ہیگل، مارکس، انگلز کی کتابیں پڑھیں اور "اشتراکیت اور اسلام" کے عنوان سے تقریریں شروع کر دیں، خود جامعہ عثمانیہ میں "جلسۂ میلاد النبی" کے سلسلے میں اس عنوان پر ایسی علمی تقریر کی کہ سب قائل ہو گئے ——— حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ ہر علم خدا کی محبوب امت کی اصلاح کی غرض سے سیکھتے جاتے تھے اسی لئے بہت کم عرصہ میں ایسی مہارت حاصل ہو جاتی تھی کہ ذہین سے ذہین لوگ بھی حیرت کرنے لگتے تھے۔

اردو ادب کے متعلق مرحوم کی معلومات ایک ماہر پروفیسر سے کم نہ تھیں، اردو کا کوئی شاعر، مضمون نگار، افسانہ نویس اور ناول نویس خواہ قدیم ترین ہو یا جدید ترین مرحوم کی تنقیدی نگاہ سے پوشیدہ نہ تھا، اور اردو کا بیشتر مطالعہ ابتدائی زندگی ہی میں ہوتا تھا، لیکن تقریروں اور گفتگو سے پتہ چلتا تھا کہ اس وقت بھی اردو ادب میں مرحوم کو کیسی اچھی نظر حاصل تھی۔

علاوہ ازیں فلسفہ و نفسیات سے بھی کافی واقفیت حاصل تھی، اس کا ثبوت قرآن مجید کی تفسیر میں ملتا تھا، کیونکہ ہر آیت کی تفسیر مختلف نقاط نظر سے بیان فرماتے تھے، خصوصاً گذشتہ قوموں کے واقعات سے ان کی نفسیاتی کمزوریوں یا خوبیوں کی تحقیق اور ان کا حالیہ قوموں پر انطباق بڑے ہی ماہرانہ انداز میں فرماتے تھے۔

مرحوم کا کتب خانہ جس کا ذکر ڈاکٹر رضی الدین صاحب نے بھی فرمایا ہے اعلیٰ علمی کتابوں سے بھرا پڑا ہے، لیکن اس وسیع کتب خانہ کا بڑا حصہ تفاسیر اور دیگر مذہبی کتب پر مشتمل ہے اور اکثر عربی زبان میں ہیں، بقیہ حصہ میں ادب سیاسیات، معاشیات وغیرہ کی کتابوں کا ذخیرہ ہے ——— سیاسیات، معاشیات

اور مذہبیات پر جو بھی معیاری کتاب نکلتی مرحوم ضرور فراہم کر لیتے تھے۔

غرض قدرت کی جو نوازشیں مرحوم پر رہیں، اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہر چیز وہبی تھی، کسب کو کوئی دخل ہی نہ تھا، مرحوم نے نہ صرف علم بلکہ ہر چیز نہایت محنت و مشقت سے حاصل کی تھی البتہ صلاحیتیں چونکہ بہت اعلیٰ تھیں، نتائج بھی عام معیار سے زیادہ پرشکوہ برآمد ہوئے۔ چالیس برس کی عمر بھی کوئی عمر ہے، خصوصاً ایک تنومند پٹھان کے لئے تو یہ جوانی ہی کی عمر ہے، لیکن پھر تین چار برس سے عینک کیوں چڑھ گئی تھی؟ اسی کثرت مطالعہ کی وجہ سے باوجود عملی مصروفیتوں کے مطالعہ کا ذوق کہیں کم ہوتا ہی نہ تھا، اور ذخیرۂ علم میں اضافہ کا خیال ہمیشہ لگا ہی رہتا تھا؛

مطالعہ کا ایک خاص انداز تھا، یہ نہ ہوتا کہ جو کتاب ہاتھ لگی پڑھنے لگ گئے، ایسے منتشر مطالعہ سے نہ ان کو فائدہ ہو سکتا تھا نہ کسی کو ہو سکتا ہے۔ طرز یہ رہا کہ ایک سال کے لئے کوئی ایک فن منتخب کر لیتے اور اس پر جتنی کتابیں مل سکتیں یا پڑھ سکتے تھے خوب غور سے پڑھتے، لیکن اس میں بھی اس بات کا خاص خیال رکھتے کہ پہلے اصول اور نظریوں کی کتابیں وقت نظری سے دیکھ ڈالتے پھر اطلاقی ( Applied ) کتابوں کا مطالعہ کرتے، بجز ان دنوں کے جب حیدرآباد سے باہر ہوتے، مطالعہ اپنے خاص وقت پر فرماتے تھے، البتہ قرآن اور تفسیر کا مطالعہ ابتداء سے اخیر عمر تک برابر جاری رہا، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہر فن کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھنے کی عادت تھی ——— اسی تقابلی اور صحیح مطالعہ کا نتیجہ تھا کہ جس محفل میں ہوتے ہی شمع بزم دکھائی دیتے، معاشیات اور تاریخ کے میدان میں گوئے سبقت ہمیشہ ہی لیجاتے، بحر تفسیر کی شناوری اپنے اچھوں نے تسلیم کی، سیاست کے اکھاڑے میں جیت

سب ہی نے دیکھی، اردو ادب کا ذکر ہی کیا کہ یہ چشمہ دراصل یہیں سے پھوٹتا تھا ——— بہ ہر کیف رائج الوقت علوم عمرانی میں مرحوم کو کافی دستگاہ حاصل تھی۔

**زبانوں کا ملکہ** کسی زبان پر قابو حاصل کرنا ہر شخص کے لئے نہ صرف مشکل بلکہ اکثر صورتوں میں محال ہے، دماغ خواہ کتنا ہی تربیت یافتہ ہو، اس کا ہر ایک غیر مانوس زبان کو قبول کرنا ضروری نہیں، راقم سوانح کے ایک استاد مولانا عثمان جعفری پروفیسر دینیات، جامعہ عثمانیہ کے چند قابل ترین اساتذہ میں سے ہیں، علوم مذہبیہ میں ید طولیٰ رکھتے ہیں اور جدید علوم سے واقفیت کا ذوق بھی موجود ہے، چونکہ رائج علوم کا بڑا ذخیرہ انگریزی میں ہے اس لئے مولانا نے انگریزی زبان کے حصول کی کوشش فرمائی۔ خود فرماتے تھے کہ تقریباً ۱۲ سال تک وہ اس کی سعی فرماتے رہے اور نہ مختلف اساتذہ سے درس لیتے رہے لیکن چوتھی پانچویں کتاب سے آگے بڑھ ہی نہ سکے، ہر مرتبہ ارادہ فرماتے کہ اب سیکھ کر ہی رہونگا لیکن طبیعت ہمیشہ مایوس کر دیتی ——— یہ ایک مثال پیش کی گئی، ورنہ بات عام ہے۔ البتہ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو ہر زبان بڑی ہی آسانی سے آجاتی ہے، یہ چیز بالکل غیر اختیاری اور خداداد ہے ——— مرحوم قائد ملت کو اللہ تعالیٰ نے اس وصف سے بھی پوری طرح متصف فرمایا تھا، یہی وجہ تھی کہ مرحوم بہت جلد کوئی زبان سیکھ جاتے اور اس پر قابو پا لیتے تھے، وہ سین بھلایا نہیں جا سکتا جب تفسیر میں ایک روز بعض دیہاتی نو مسلم اور ایک نو وارد عرب شریک تھے، تفسیر ختم ہو چکی، مرحوم ہر دو سے مخاطب ہوئے، ادھر ان سے تلنگی زبان میں کلام فرما رہے تھے، ادھر عرب صاحب سے عربی میں گفتگو جاری تھی ———

زبان اُردو کا مرحوم نے بہت گہرا مطالعہ فرمایا تھا، اردو ادب کی کوئی صنف ایسی نہ تھی جس کا اعلیٰ لٹریچر مرحوم کی تنقیدی نظر سے نہ گزرا ہو، نسلی پٹھان ہونے کی حیثیت سے گھریلو زبان تو ٹھیٹھ دکھنی تھی، لیکن اکتساب اور قدرت کی مدد سے زبان پر وہ قابو حاصل کر لیا کہ اچھے اچھے اہل زبان بھی عش عش کرتے تھے، زبان کے بنانے میں مرحوم پر شرر، آزاد، اور ابوالکلام کے خاص اثرات پڑے، خود مرحوم اس کے معترف تھے، مرحوم کی زبان اپنے اندر فصاحت و بلاغت، تشبیہ، استعارہ و کنایہ کی پوری خوبیاں رکھتی تھی اور چونکہ نہ لکھنوی تھے نہ دہلوی اس لئے بہت معیاری اور کسی خاص خطہ کے اثر سے منزہ زبان بولتے تھے، ـــــ مرحوم کو اردو پر یہ قابو صرف بولنے اور تقریر کرنے ہی کی حد تک حاصل نہ تھا بلکہ وہ اس زبان کے ایک اچھے ناقد بھی تھے، "انجمن ترقی اُردو کے جلسوں کی تقاریر اس کی شاہد ہیں، حق تو یہ ہے کہ مصنفین اُردو سے شاید کچھ ہی کم مرحوم نے اردو کی خدمات انجام دیں جس کے مولوی عبدالحق صاحب بھی معترف ہیں۔ مرحوم کی دلنشین اور اثر آفریں تقریریں جو ہندوستان کے طول و عرض میں ہوتی رہیں، ان سے نہ صرف اردو کا ایک اعلیٰ معیار قایم ہوا بلکہ بہت سوں کو اردو کی تحصیل کا ذوق اور اس کی خدمت کا شوق پیدا ہو گیا ـــــ مرحوم کی اردو دانی سے متعلق اس سے زیادہ تفصیل آفتاب کی تنویر کے دلائل لانے کے مماثل ہوگی۔

ابتدائے سوانح ہی میں بتایا جا چکا کہ صرف عربی زبان ایسی تھی جس کی تعلیم مرحوم نے اساتذہ سے باضابطہ پائی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ نہ صرف عربی کتابیں بہ آسانی پڑھتے اور سمجھتے تھے بلکہ عربی بولنے پر بھی پورا قابو حاصل تھا، ایک ایسے ماحول میں رہتے ہوئے جہاں عربی بولنے کا موقع بھی نہ ملے

ایسی قدرت حاصل کرنا بجز خدا داد صلاحیت کے اور کیسے ممکن ہے؟ مصر میں نحاس پاشاہ سے عربی میں جو بے تکلف گفتگو رہی مصری اخبار اس کے شاہد ہیں۔ انتقال سے ڈیڑھ دو سال قبل جب مصر کے قونصل جنرل حیدرآباد آئے ہوئے تھے تو مرحوم نے بھی ان کے اعزاز میں ایک عصرانہ ترتیب دیا، مدعوین میں علاوہ اکبر حیدری وزیر اعظم اور دیگر حکام کے شہر کے تمام علماء و مشائخین بھی تھے، اس سلسلے میں مرحوم نے ایک پرجوش اور اثر آفریں تقریر عربی زبان ہی میں فرمائی، جس سے سب لوگ متحیر ہو گئے اور خود قونصل نے بھی جوابی تقریر میں اظہار تعجب کیا کہ ہندوستان میں ایسے بھی لوگ ہیں جو عربی میں اس بے تکلفی اور فصاحت کے ساتھ تقریر کر سکتے ہیں، جن لوگوں نے مرحوم کی یہ تقریر سنی ان کا بیان تھا کہ وہی روانی اور اثر تھا جو اردو تقاریر میں پایا جاتا ہے ۔۔۔۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مرحوم اکثر عربی تفاسیر کا مطالعہ فرماتے تھے ۔۔۔۔

فارسی زبان کے متعلق مرحوم خود فرماتے تھے کہ میں نے گلستان جیسی ابتدائی کتاب بھی کسی سے نہیں پڑھی، البتہ عربی زبان نے مجھے اس کے حصول میں بڑی مدد دی۔ مرحوم کا خیال تھا اور غالباً بہت صحیح تھا کہ عربی زبان سیکھ لینے پر دوسری زبانوں کا حصول بہت ہی آسان ہو جاتا ہے، چنانچہ ایک دفعہ ہنستے ہوئے فرمایا کہ گو میں نے فارسی سبقاً کبھی نہیں پڑھی لیکن کوئی آ جائے مقابلہ کے لئے ۔۔۔۔ اس سے تعلی مقصود نہ تھی بلکہ جس انداز میں یہ الفاظ نکلے تھے، اس کا منشاء یہ تھا کہ عربی سیکھنے کے بعد فارسی زبان پر قابو پا لینا کوئی مشکل کام نہیں رہ جاتا، ویسے فارسی ہے بھی کونسی کٹھن زبان! غرض مرحوم کے ذاتی مطالعہ اور ایران کے سفر نے ان کو اس باق

پورا قابو عطا کیا، فرماتے تھے کہ جب ایران گیا تو ابتداءً جھجک محسوس ہوئی، لیکن پھر اس خیال سے کہ آخر فارسی کے لئے میں اجنبی ہی ہوں، پوری دلیری سے گفتگو شروع کر دی، بہت تعجب ہوا کہ چند ہی دنوں میں میں بلا تکلف اظہار خیال کرنے لگا اور کبھی انگشت نمائی کا موقع ہی نہ آیا بلکہ تحسین و تعریف ہی ہوئی، چنانچہ جب غازی نادر پاشاہ نے مرحوم کی بے تکلف اور بامحاورہ گفتگو سنی تو انہیں بڑا تعجب ہوا، اور اپنے مصاحبین سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے :۔

"نواب صاحب در زبان فارسی خیلے خوب گپ می زنند"

("گپ زدن" ایران کے محاورہ میں بامحاورہ گفتگو کرنے کو کہتے ہیں) یہ واقعہ راقم نے خود مرحوم کی زبانی سنا، اور ان کا ہر قریبی ملنے والا اس سے بخوبی واقف۔

نہ صرف یہ کہ مرحوم کو بامحاورہ گفتگو پر قدرت حاصل تھی بلکہ تلفظ اور لہجہ تک ان کا مطیع تھا۔ جب فارسی پڑھتے یا بولتے تو بالکل ایرانی طرز میں۔

فارسی دانی کی ایک اور سند ملاحظہ ہو، خسرو دکن کی فارسی قابلیت بلا اختلاف کسے مسلم ہے، ایک مرتبہ بہ الطاف شاہانہ مرحوم کو "خاصہ" سے سرفراز کیا گیا، مرحوم کے دولت کدہ "بیت الامت" میں مجلس اتحاد المسلمین کی عاملہ کا اجلاس ہو رہا تھا، جیسے ہی "خاصہ" پہنچا مرحوم نے سپاس کے طور پر جواب میں چند جملے لکھ بھیجے، جو حضرت آصف سابع پر بہت اثر انداز ہوئے، دوسرے ہی روز اخبار صبح دکن، جس میں اکثر فرامین شایع ہوتے رہتے ہیں، مرحوم کی وہ تحریر اپنے توصیفی جملوں کے ساتھ شایع فرما دی، ملاحظہ ہو:۔

"نقل پرچۂ رسید طعام برائے بہادر یار جنگ

تحریر بہادر یار جنگ بہ زبان فارسی

فدوی جاں نثار موروثی از زلۂ تایدۂ ظل اللہ سرفراز گشتہ۔

ہمہ جاں نثاران سلطنت آصفیہ و وابستگانِ دامن حضرت شمس الملت والدین، کہ ارکان مجلس عاملۂ صدر مجلس اتحاد المسلمین و اخص خدمت گذاران حضرت بندگانعالی ہستند و جان و مال خویش برائے حفاظت سلطنت اسلامیہ آصفیۃ (حفظہا اللہ عن کل آفات وبلیۃ) وقف کردہ اند، و این وقت بہ کلبۂ احزانِ این وفاشعار مصروف فکر و نظر بودند، از الطاف جہاں پناہی بہرہ اندوز و مفتخر گشتند و بہ بارگاہِ جل وعلیٰ دعاگذار ہستند کہ

الٰہی آفتاب عمر و اقبال شاہ دین پناہ ما کہ قلب او پیمانۂ لبتب زبادۂ حب رسول (علیہ افضل الصلوٰۃ والتحیات) است تا ابد تابان و درخشاں باد۔ آمین بحق طٰہٰ ویٰسین۔

بہادر یار جنگ.

ف ۲، بہ بہ کہ او اگرچہ مثل ما از خاک شیراز و اصفہان نیست تاہم قلم او چہ خوب فارسی می نویسد، و این سبب حصول علم و فضل است (بہ حد خویش) ورنہ با محاورہ فارسی نوشتن یا گفتن، خصوص برائے ابنائے دکن کارے دارد، و ما ارادہ می داریم کہ حتی الامکان با او بہ ہمین زبان گفتگو می کنیم و ہم تحریر می نویسیم چراکہ مزاولت بہ السنۂ دیگر ضرورست ورنہ ما بہ آنہا نا آشنا می باشیم، در آن حالیکہ مزاولت نباشد۔ راست است کہ ذوق و شوق ہم چیزے ہست کہ

ما او را نظر انداز کردن نمی توانیم، خصوص آن وقت که جانِ او
بہ جسمِ زبانِ مردہ پیش نظر باشد یا قلبی اِتصال بوجہ چاشنی و ہم
شیرینی۔

(صبح دکن مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۴۲ء)

یہ تھی بے ساختہ تعریف مرحوم کے چند بے تکلف جلوں کی، فارسی زبان
پر اتنا قابو، بغیر کسی استاد سے زبان سیکھے اللہ تعالیٰ کی دین نہیں تو اور کیا ہے؟
مرحوم کی انگریزی تعلیم صرف میٹرک کے درجہ تک ہوئی تھی، میدان سیاست
میں اتر آنے سے اس زبان کا حصول ناگزیر ہو گیا، مرحوم نے کتابیں پڑھنی شروع
کیں اور انگریزی سیکھ جانے کا مصمم ارادہ کیا، نیت پاک تھی، نہ اپنی بڑھائی اور
ہمہ دانی کا مظاہرہ مقصود تھا، نہ محض اس وجہ سے رغبت ہوئی تھی کہ صاحب
بہادر کی زبان ہے، بلکہ مسلمانوں کی خدمت اور ان کی صحیح رہنمائی کے لئے
اس پر قابو حاصل کرنا ضروری تھا، اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال رہی اور بہت
تھوڑے عرصہ میں اس زبان پر بھی قابو حاصل ہو گیا بے تکلف سمجھنے، لکھنے
اور بولنے لگے، ایک دفعہ مسز سروجنی نائیڈو کی ایک مختصر اردو تقریر سنی
تو فرمانے لگے "اگر مسز سروجنی اردو میں تقریر کر سکتی ہیں تو کیا محمد بہادر خاں
انگریزی جیسی آسان زبان میں تقریر نہیں کر سکتا؟" —— اس قول کے
کئی ثبوت ملے، گو مرحوم کو انگریزی تقریر کا کبھی موقع ہی نہ ملا لیکن جو لوگ
صرف انگریزی ہی جانتے تھے اور مرحوم سے ملتے رہتے تھے، انھوں نے
اس کی تصدیق کی، قائد اعظم محمد علی جناح جیسی کچھ بامحاورہ، معیاری زبان
بولتے ہیں اور جیسا کچھ پختہ لب و لہجہ ان کو حاصل ہے، سب پر ظاہر ہے،
الہ آباد اور کراچی کے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ جلسوں میں قائد اعظم

کی جو فصیح و بلیغ صدارتی تقریریں ہوئیں، ان کا فی البدیہہ ترجمہ اچھے اچھے انگریزی دانوں کے لئے بھی مشکل ہی تھا، قاید اعظم کے حکم پر ان کی تقریر ختم ہوتے ہی نواب صاحب مرحوم نے اس کا ایک صحیح اور اعلیٰ ترجمہ سنایا کہ سب ششدر رہ گئے کوئی مفہوم اور خیال تو کیا چھوٹتا قاید اعظم کا کوئی محاورہ تک چھوٹنے نہ پایا اور ہر محاورہ کا اس کے مترادف اردو محاورہ میں اس بے تکلفی سے ترجمہ پیش کر رہے تھے جو صرف ایسے ہی شخص سے ممکن تھا جو دونوں زبانوں پر پورا پورا قابو رکھتا ہو ——

عبدالغفار خاں سرحدی گاندھی کی ہستی محتاج تعارف نہیں، ان کی سحر کاریوں سے سرحد کے مسلمان گاندھی جی اور کانگریس کے پرتو کو اپنے حق پر سایۂ ہما سمجھنے لگے تھے، مسلم لیگ کے بڑے بڑے مبلغین اس سحر کو توڑنے سے عاجز رہے، قاید اعظم کی حقیقت شناس نگاہوں نے بہادر یار جنگ کو اس کام کے لئے منتخب کیا؛ مرحوم اردو کے اعلیٰ ترین خطیب سہی لیکن سرحد میں اس آلہ سے کیا کام چل سکتا تھا، معقول مشاہرہ پر ایک اہل زبان افغانی کو پشتو سیکھنے کے لئے مقرر فرمایا، دو مہینے کی مشقت نے کام آسان کر دیا، اور پشتو زبان بولنے لگ گئے۔ اب سرحد کا قصد کیا اور وہاں مسلسل اس زبان میں تقریریں کیں اور غفار خانی طلسم کو توڑنے میں کامیابی حاصل ہوئی، مسلم لیگ کے قدم مضبوط ہو گئے —— یہ کوئی قصیدہ گوئی یا مبالغہ نویسی نہیں بلکہ حقیقت ہے، آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی غرض سے جب سردار اورنگ زیب خاں مع دوسرے مسلم لیگیوں کے گلبرگہ پر سے گزر رہے تھے تو مسلمانان گلبرگہ نے ان لوگوں کا اسٹیشن پر پرجوش استقبال کیا، چند نوجوانوں نے، جن میں راقم ہذا کے ایک معتبر

دوست بھی تھے، بڑھ کر سردار اورنگ زیب خاں سے پوچھا: "کیا یہ صحیح ہے کہ ہمارے قاید ملت پشتو زبان بھی بولتے ہیں" ــــــ سردار صاحب نے جواب دیا "جی وہ بولتے کیا ہیں تقریر بھی فرماتے ہیں، سرحد میں انھوں نے اس زبان میں کئی تقریریں فرمائیں۔"

ان زبانوں کے علاوہ دو مقامی زبانیں مرہٹی اور تلنگی سے بھی واقف تھے، تبلیغی کام چونکہ مرہٹواڑہ اور تلنگانہ کے مختلف گوشوں میں ہوا تھا، اس لئے مرہٹی اور تلنگی زبانوں سے واقفیت ضروری تھی، لیکن یہ صرف اظہار خیال کی حد تک تھیں، مرحوم ان زبانوں میں لکھ پڑھ نہ سکتے تھے۔

اس کے علاوہ دکن کی دیہاتی اردو، اس روانی اور بے تکلفی سے بولتے تھے اور دیہاتی محاوروں سے اتنے واقف تھے کہ "جیسے سچ مچ دیہاتی ہیں اور شہر کی ہوا تک نہیں لگی" اس کا سبب بھی تبلیغی خدمات ہیں۔ ظاہر ہے کہ بیچارے دیہاتیوں کے سامنے مرحوم کی فصاحت و بلاغت کیا کام دے سکتی تھی، اس لئے مرحوم نے انہی کی زبان اختیار کر لی تھی، لیکن کمال یہ تھا کہ جس وقت جس قسم کی زبان میں چاہتے ایسی گفتگو فرماتے گویا دوسری زبان سے واقف ہی نہیں، چنانچہ مجلس اتحاد المسلمین کے یادگار رسالانہ جلسہ جالنہ (ضلع اورنگ آباد) میں مرحوم نے اسی زبان میں اختتامی تقریر فرمائی، دیہاتی ہزاروں کی تعداد میں جمع تھے اور انہیں سیاست کا درس دینا تھا۔ مجلس کے مختلف مقررین نے اچھی اچھی تقریریں کیں لیکن پہلے تو سیاسی مسائل مشکل پھر چاہے کتنی ہی سلیس زبان ہو ان کے لئے دقت طلب ہی تھی، اسی وجہ سے مرحوم نے "حیدرآباد کی سیاست" پر تقریباً ڈھائی گھنٹہ دیہاتی اردو میں تقریر فرمائی، حیدرآباد کی اجمالی تاریخ، حکومت کے نقائص، کانگریس کی ریشہ دوانیاں

اور مجلس کا مقصد، سب ہی مسائل آ گئے لیکن لطف یہ کہ محاورے تو یہاتی تشبیہیں دیہاتیوں ہی کی اور لہجہ بھی انہیں کا رہا، اور روانی، طرز تفہیم ویسا ہی انوکھا اور دلنشین جو مرحوم کا خاص وصف تھا۔ سارے پڑھے لکھے دنگ تھے کہ قیادت ایسی ہی جامع ہستی کو زیب دیتی ہے! جب جلسہ ختم ہوا تو دیہاتیوں کے چہروں پر خوشی کھیلتی ہوئی، پیشانیوں سے سیاست فہمی کے آثار نمایاں اور آپس میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں، سمجھ گئے کہ حکومت کس ڈگر پر چل رہی ہے اور قائد ملت کونسی راہ بتا رہے ہیں! ــــــ ع

این سعادت بزور بازو نیست

اکتساب کے حدود معین اور اس کے نتائج بھی متعین ہیں، اس سے آگے جو کچھ ملتا ہے وہ سب اس بے طلب دینے والے کی بے پایاں عطا ہے، جو ہر ایک کے لئے نہیں! ــــــ

**طبع شاعرانہ** | مرحوم کو شاعری کا اعلیٰ ترین ذوق حاصل تھا، لیکن اس سے عمداً کام نہیں لیا گیا، خود فرماتے تھے کہ میں بالارادہ اس جذبہ کو دباتا ہوں کیوں کہ شاعر بالعموم عمل سے دور ہوتے ہیں اور مجھے کچھ کام کرنا ہے پھر بھی جب یہ جذبہ قوی ہوتا تو فی البدیہ کہہ جاتے، فرماتے تھے کہ بالعموم میرا ذہن اس وقت شاعری کرنے لگتا ہے جب میں موٹر میں بیٹھا ہوتا ہوں، ورنہ اور اوقات میں تو اس کی فرصت بھی نہیں ملتی ــــــ ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ان کے عاشق زار کا شعر سنیئے۔

"اے کہ ترا سر نیاز حد کمال بندگی
اے کہ ترا مقام عشق قرب تمام عین ذات

بعض دفعہ ماحول خود کہلواتا تھا، چنانچہ "یادگار یوم خودمختاری"

کا جلسہ ہو رہا تھا، مجلس کے ایک پرخلوص کارکن مولوی سید محمد قاسم رضوی بی اے ال ال بی نے ایک فی البدیہہ رباعی قاید ملت کی خدمت میں پیش کی جو یاس انگیز تھی، قاید ملت نے ایک نظر دیکھا، مسکرائے اور فوراً جیب سے قلم نکال اسی کاغذ کے پشت پر اس کا فی البدیہہ قایدانہ جواب لکھ دیا:۔

کیوں اپنا قفس دیکھ کے ناشاد ہے تو
مایوس جو ہو گیا تو برباد ہے تو
گر دل ترا آزاد ہے اے صید قفس
آزاد ہے، آزاد ہے، آزاد ہے تو

اسیطرح ایک دفعہ تقریر کرتے ہوئے یہ قطعہ بڑے موثر انداز میں زبان سے نکلا تھا:

دہکتی ہوئی اک انگیٹھی ہوں یا دل
جہان فسردہ کو گرما رہا ہوں
سنادو یہ خاشاک باطل کو جاکر
سنبھل جائیں میں آگ برسا رہا ہوں

---

ایک دفعہ اپنی اعلیٰ خطابت پر ناز کیا تھا:۔

آگاہِ رموز دین فطرت ہوں میں
کچھ مجھ سے سنو "لسانِ امت" ہوں میں
میں خطبہ سرا نہیں تو سونی ہے بزم
شاہنشہ اقلیم خطابت ہوں میں

مرحوم کے "شاہنشہ خطابت ہونے میں کیا کلام تھا" اور اس حیثیت سے یہ رباعی اظہارِ حقیقت کی حامل تھی، تعلّیِ شاعرانہ سے پھر بھی گریز تھا، لیکن بہرحال یہ بات شانِ عبدیت کے خلاف ہی تھی کیونکہ "عطا" کی جگہ "استحقاق" کی بو آرہی تھی، معاً کہہ اُٹھے :۔

دولت کو جہاں کی آنی جانی سمجھو
عزت کو خدا کی اک نشانی سمجھو
اِتراؤ نہ اپنی خوش بیانی پر خلیقؔ
اس کو بھی خدا کی خوش بیانی سمجھو!

ضمیر کی آواز پر کان کیسے لگے ہوئے تھے کہ شاعری میں بھی فخر کی کھٹک خطرہ کی گھنٹی کی طرح چونکا دیتی ——— مرحوم خلیقؔ تخلص فرماتے تھے ؛

بہرحال اسی طرح بعض موقعوں پر کچھ کہہ دیتے، لیکن نہ کبھی کہنے سے پہلے اہتمام ہوتا نہ بعد میں اس کی حفاظت کا خیال ؛

**قلبِ مومن** اِس مضبوط اور خوب صورت حصار کے اندر، جسے بہادر خاں کا جسم کہتے تھے، ایک عالیشان قصر تھا، جس میں ہر طرف ایمان کا نور بچھا ہوا تھا، جہاں رحمت کی ہوائیں اٹکھیلیاں کرتی تھیں اور کرم کی پھوار جھڑتی رہتی تھی، جس کے وسیع صحن میں عمل کے وہ پھول اُگتے تھے جن کی عطر بیزیوں سے ہزاروں جھونپڑیاں مہک اُٹھیں ۔

محمد بہادر خاں کی بے کلاہ بادشاہت کا راز ؟ اغیار کے قلعوں کی بے پناہ تسخیر کا سبب ؟ کیا محض بیان کی رنگینی کلام کی فصاحت، ظاہر کا رعب تھا ؟ جی نہیں، ہرگز نہیں، ان کے اندرون کی کشش تھی، ان کے دل کی جاذبیت تھی جو ہر ایک کو قریب تر کرتی جاتی تھی ——— شکر ان کے

دل کا خاص وصف تھا، جتنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتی، شکر بڑھتا جاتا
نتیجہ یہ کہ رحمت کے بادل امنڈ امنڈ کر آتے اور برس برس کر زمین قلب کو
شاداب کرتے جاتے تھے ـــــ اللہ کا وعدہ بھی یہی ہے، جو بھی اس کا
شکر کرے گا، وہ اپنے کرم کو اور بڑھا دیگا ـــــ محمد بہادر خاں کے قصر (دل)
میں لا تقنطوا من رحمۃ اللہ کی ہواؤں کو چلتے سب ہی نے
محسوس کیا، دولت چھین لی گئی، اولاد سے محروم کیا گیا، راحت و چین
سلب کر لیا گیا، لیکن بہادر خاں کے ماتھے پر کسی نے ایک بھی شکن دیکھی؟
ہاں سب نے دیکھا اور انتہائی تعجب سے دیکھا کہ حسبی اللہ و نعم
الوکیل (کافی ہے مجھے میرا اللہ اور بہترین ذمہ دار) کہہ کر مسکراتے رہے
ـــــ قلب کی یہ اعلیٰ کیفیت نیکوں ہی کا حصہ ہے ـــــ

عجیب عالم تھا! وصول پیٹھ کے فساد میں مرحوم کے بعض رشتہ دار
مرہٹوں کے ہاتھوں قتل ہوئے، مسلمان پہلے ہی سے بپھرے ہوئے تھے
اب تو آتش انتقام اور زیادہ بھڑک اٹھی، لیکن ان اٹھتے ہوئے سر بہ فلک
شعلوں کو کس نے بجھایا؟ کیا حکومت اسے فرو کر سکتی تھی؟ ناممکن تھا، اسی
بہادر خاں نے جس کے رشتہ دار قتل ہوئے تھے، اپنی تقریروں کے سیلاب
سے اس پر قابو حاصل کر لیا ـــــ یہ قصہ نہیں حقیقت جس کو ہر آنکھ نے
تعجب سے دیکھا، مسز سروجنی نائیڈو نے بھی حیرت سے اس منظر کو دیکھا
اور بعد کو مرحوم سے کہنے لگیں "میں نے امن و سلامتی کی حالت میں اسٹیج
کے لیڈر اور مقرر تو بہت دیکھے ہیں۔ مگر انتقام کی آگ سے مشتعل اور
جوش سے بپھرے مجمع کو قابو میں لانے والا لیڈر اور مقرر میں نے آج ہی
دیکھا" ـــــ یہ چیز بغیر کوہ صفت دل کے ممکن بھی ہے؟ بہادر خاں کا بہادر دل

ایسے وقتوں کے لئے بڑا سخت تھا، لیکن یہی سخت دل کسی غریب کی تکلیف کو محسوس کرتا تو موم کی طرح پگھلنے لگتا۔

مولوی غلام دستگیر رشید (استاد ادبیات نظام کالج) ایک مرتبہ نواب صاحب کی خدمت میں حاضر تھے، مرحوم اپنی دائمی بشاشت کے ساتھ کلام فرما رہے تھے کہ ایسے میں ایک غریب ہندو (مسلمان بھی نہیں!) عورت اپنے لڑکے کو لئے ہوئے حاضر ہوئی اور بہت ہی لجاجت سے کہنے لگی "میں غربت سے مر رہی ہوں، یہ میرا لڑکا اسی سال میٹرک پاس کر چکا ہے، اگر آپ کوشش فرمائیں تو کہیں ملازمت مل جائے گی۔ آپ کے سوا میرا اب کون ہے!؟" ——— مرحوم اتنے متاثر ہوئے کہ فوراً ٹیلیفون اٹھا، کسی عہدہ دار سے سفارش فرما دی اس عورت سے کہدیا کہ انشاء اللہ بہت جلد نوکری مل جائے گی "تم چلی جاؤ" ——— عورت ابھی دروازے کے باہر بھی نہ ہوئی تھی کہ مرحوم کی آنکھوں نے اشک باری شروع کر دی، تھوڑی ہی دیر میں سسکیاں بندھ گئیں، ابھی کچھ دیر پہلے کھلکھلا کر ہنس رہے تھے اور دم کے دم میں گڑگڑا کر فریاد کرنے لگے "اے بارالٰہا! یہ تیرا گنہگار اور عاجز بندہ، اس سے تیری خلق کی کیا خدمت ہو سکتی ہے، اس میں طاقت ہی کیا ہے!"

یہ ہے وہ بہتا ہوا دل جو اپنی ذاتی مصیبتوں میں جگہ سے ہلتا بھی نہ تھا، اور یہاں تو ایک مثال پیش کی گئی ورنہ ایسے کئی مواقع آتے رہے اور لوگوں نے اس تضاد کا بارہا مشاہدہ کیا ——— یہ ہے وہ قائد جس کی تعمیر سیرت طیبہؐ کے خاکہ پر ہوئی تھی، نرے سیاسی اور معاشی لیڈروں کی سوانح ایسی مثالیں کہاں پیش کر سکتی ہیں؟ یہاں ظاہر میں قیادت تھی، شوکت تھی، عظمت تھی لیکن "دل" کسی کے آگے ٹکڑے ٹکڑے تھا، ریزہ ریزہ تھا، اور یہی وجہ تھی کہ نتائج بھی ایسے شاندار رونما ہوئے۔

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ
خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ

مومن کے قصرِ دل کو مصیبت کے طوفان، تخویف کی بجلیاں، تحریص کے زلزلے ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ ہاں مظلوم کی کراہ اور مغموم کی آہ سے اس میں زلزلہ آجاتا ہے ——

وہ دل جو عالموں کے مجمع میں تقریر کرتے ہوئے، فاضلوں کی محفل میں بحث کرتے ہوئے اور میدانِ عمل کی مصیبتوں کو برداشت کرتے ہوئے —— سخت ترین معلوم ہوتا تھا، تفسیر بیان کرتے وقت، سیرت طیبہ سناتے ہوئے اور مالک الملک کی جناب میں حاضری پر طفلِ خوف زدہ کی طرح لرز لرز کر رونے لگتا —— "رجا" کی مسکراہٹ سبھوں نے دیکھی لیکن "خوف" کی یہ لرزشیں بھی بہت سوں کی نظروں سے پوشیدہ نہیں، یہی چیز تھی جو ان کے ایمان کو ہمیشہ پختہ رکھتی تھی کیونکہ "الایمان بین الخوف والرجا" پیغمبر صادق (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سمجھایا ہوا نکتہ ہے! اور کیا یہ رونا، بلبلانا کسی کا رائگاں گیا ہے؟ اسی گریہ میں وہ خندہ پوشیدہ ہے جو دائمی ہے اور حقیقی ہے!

مومن کا کاشانۂ دل، غیبت، حرص، جھوٹ، بخل، اسراف اور حسد کے کوڑا کرکٹ سے پاک رہتا ہے۔ الحمدللہ کہ مرحوم ان خصائل رذیلہ سے محفوظ تھے، اس کے ثبوت پچھلے مختلف ابواب کے واقعات میں موجود ہیں اور آئندہ "حسن سلوک" اور "مخالفتوں پر مسکراہٹ" وغیرہ عنوانات کے تحت بھی آئیں گے، ان کا اعادہ یہاں غیر ضروری ہے —— بس یہاں اتنا جان لینا کافی ہے کہ مرحوم وقت آخر تک وہ دولت جمع کرتے رہے جس کی تاکید کی گئی اور وہ تمام لٹاتے رہے جس کے جمع کرنے سے روکا گیا تھا ——

جب دفینوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی " الذین یکنزون الذھب والفضۃ الخ" تو حضرت عمر نے عرض کیا تھا کہ " حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم کونسا مال رکھیں" جواب عطا ہوا تھا " لیتخذ احدکم لسانا ذاکراً وقلباً شاکراً " یعنی چاہئے کہ تم سے کوئی زبان ذاکر اور دل شاکر حاصل کرے"۔۔۔۔ محمد بہادر خاں کے ایثار کا باب اس کا شاہد ہے کہ کس طرح انھوں نے بہت کچھ لٹا کر اس دولت کے حصول کی سعی فرمائی۔ خدا ان کی روح کو اعلیٰ مقامات سے سرفراز کرے۔

مرحوم کے دل میں کوئی شخص دولت و ثروت کی بنا پر تو کیا رُسوخ حاصل کر سکتا محض کسی کی علمیت بھی ان کو مرعوب نہ کر سکتی تھی، لیکن ایک کم علم اور پُرخلوص کام کرنے والے سے بہت متاثر ہوتے تھے، ان کے نزدیک معیار حسن عمل اور صرف بے لوث اور بے ریا عمل ہی تھا، اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کام کرنے والوں کی جتنی ہمت افزائیاں مرحوم کے پاس ہوتی تھیں، کہیں اور نہ ہو سکتی تھیں، سامنے گو زیادہ تعریف نہ کرتے لیکن اس کے غیاب میں تحسین فرماتے اور دعائیں دیتے تھے، راقم سوانح کے ایک دوست اکثر فرمایا کرتے ہیں کہ جب میں نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا تو پہلا سوال یہی ہوتا کہ مجلس کے کتنے ارکان میں اضافہ کیا گیا جب میں کہتا کہ تین یا چار ہی ارکان بنائے جا سکے تو فرماتے " اس سُست رفتاری سے بھی کہیں کام چل سکتا ہے" " خیر اور کوشش کیجے" لیکن بعد میں دوسروں سے پتہ چلا کہ مرحوم فرماتے تھے " میاں تین، چار مسلمانوں میں بھی صحیح احساس پیدا کرنا کوئی آسان بات ہے؟ اگر ہر مسلمان اسی طرح دو تین ہی افراد کو راہ راست پر لائے تو مجلس کا ایک بڑا کام ہو چکا"۔۔۔۔ یہ تھی

محبت و قدر ان کے پرخلوص دل میں اپنے رضاکاروں کی، یہی وجہ تھی کہ ان کے ساتھ کام کرنے والے کبھی یہ محسوس ہی نہ کرتے تھے کہ وہ کسی سخت گیر انسان کے تحت کام کر رہے ہیں بلکہ یوں سمجھتے گویا باپ یا چچا کی اطاعت کیجا رہی ہے ——— اندرون کی کشش کا یہ اثر ہوتا ہے!

## عشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)

محمد عربی کآبروئے ہر دو سراست
کسے کہ خاک درش نیست خاک برسر او

عشق رسولؐ کے معنی کیا ہیں؟ کیا محض پیغمبر آخر الزماں کے نام کی مالا جپنا؟ یا بلا عمل سے ثابت کئے ان کے پیغام اور ان کی حیات پاک کی توصیف میں زبان خشک کرنا؟ یہ تو "عشق" نہ ہوا " ہوسناکی" ہوئی، عشق نام ہے پابندیوں کا، اور ان کو اپنی مرضی سے خوشی خوشی عاید کر لینے کا؟ فرہاد کو کس نے مجبور کیا تھا کہ شیرین کی محبت میں گرفتار رہا اور وہ سختی اٹھائے جو عقل پرستوں کے تصور میں بھی نہ آسکتی تھی؟ اور اگر بالفرض وہ مجبوراً اس محبت میں گرفتار ہوتا تو کیا جوئے شیر لا بھی سکتا تھا؟ ——— رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم کی محبت کے جھوٹے دعویدار بہت سے ہیں، بلکہ ہر مسلمان ہے لیکن حقیقی عاشق صرف چند ہی ملیں گے۔ فرائض واجبات اور مستحبات کا کیا ذکر عشق رسولؐ تو "فعل رسول" اور " قول رسول" کے فرق کو بھی مٹا دیتا ہے اور ایک عاشق کے لئے چھوٹی سے چھوٹی سنت بھی فرض کی شان رکھتی ہے ———

محمد بہادر خاں (اعلی اللہ مقامہ) کو عشق رسولؐ سے وافر حصہ ملا تھا جس کا نتیجہ ان کا سارا عمل تھا، ——— مرحوم کی کونسی تقریر ہوتی جس میں سیرت طیبہ کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی نہ ڈالی جاتی، حیات کا سرمایہ تو یہی تھا بغیر اسے لٹائے ہوئے اور عام کئے ہوئے حیات پیدا ہی کیسے کی جاسکتی تھی؟

مرحوم اس دولت گرانمایہ کو اپنے قافلے میں خوب لٹاتے رہے — تقریر کی روانی، فصاحت، و بلاغت کب حاصل نہ تھی لیکن جہاں سے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ شروع ہوتا تو معلوم ہونے لگتا کہ بہتے ہوئے دریا میں طوفان آگیا، مرحوم کا ایک ایک عضو متاثر ہو جاتا اور پھر کیا تعجب ہے کہ تقریر کی رو میں تاثیر کا دریا بھی آملتا اور جن جن خشکیوں کی طرف گزر جاتا اُن کو زرخیز کر دیتا، جب کبھی کسی معاشی یا سیاسی تقریر میں اور لوگوں کے نظریئے بیان کر چکتے اور اب سیرت طیبہ کا رخ پر نور دکھانا ہوتا تو یوں فرماتے " یہ سب تو آپ لوگوں کی تسلی کے لئے کہا گیا ورنہ

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

بس اس کے بعد خود بھی اتنے متاثر ہو جاتے کہ تقریر کے بعد کافی دیر تک کسی سے بات بھی نہ فرماتے تھے۔

بہرحال یہ تو تقریر کا ذکر ہوا، عمل کا جو حال تھا وہ ابتدائی ابواب میں آچکا اور آئندہ بھی اس کی مزید وضاحت ہوگی، بدعات کو توڑنا رسم و رواج کے اثر کو حتی الامکان ختم کرنا، اپنوں کے ساتھ شفقت، پرایوں کے ساتھ بے مثل سلوک، آخر یہ سب اسی عشق ہی کے تو نتائج تھے — اور پھر یہ عشق کا نہیں تو کس چیز کا اثر تھا کہ جاگیر کھو کر، خطاب واپس کر کے، آرام و چین کو تج کر اکثر یہی دعا مانگتے تھے۔

" اللھم احیینی مسکیناً و امتنی مسکیناً و احشرنی فی زمرۃ المساکین "

یہی نہیں بلکہ عشق کی زبان بھی خوب سیکھ لی تھی، کپڑے پہنتے ہوئے گھر سے

باہر نکلتے ہوئے، سواری پر چڑھتے ہوئے، غرض ہر ہر موقع پر ہونٹ بیساختہ ہلنے لگتے اور وہی الفاظ سنائی دیتے جو ایسے مواقع کے لئے رسول مقبولؐ نے بتائے تھے، مرحوم کو ادعیہ ماثورہ بہت یاد تھی اور ہمیشہ پڑھتے رہتے تھے، حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس کا ایک ثبوت پیش کیا ہے جو یہاں درج کیا جاتا ہے۔

۶ اپریل ۱۹۴۲ء لکھنو۔

نواب یوم اقبال کی صدارت کرکے، ندوہ میں ڈالی باغ میں، گنگا پرشاد میموریل ہال میں معرکہ کی تقریریں کرکے صبح کی گاڑی سے براہ دہلی حیدرآباد جا رہے تھے، میں صبح ۸ بجے ان کی قیام گاہ پر پہنچتا ہوں، خیال یہ ہے کہ یہاں سے اسٹیشن تک مفصل بات چیت رہے گی۔ موٹر ادھر اسٹارٹ ہوتا ہے ادھر نواب کی زبان دعاؤں پر کھلتی ہے سواری پر سوار ہونے کی دعا ہوگی، ابھی ختم ہوئی جاتی ہے لیکن یہ کیا؟ کہاں ابھی ختم ہوئی، دو سکنڈ، چار سکنڈ، بیس سکنڈ، ایک دعا، دو دعائیں سلسلہ ہے کہ ختم ہونے ہی نہیں پاتا۔ اور دعائیں زیادہ تر حدیث کی —— یا الٰہی یہ آل انڈیا لیڈر ہیں یا حصن حصین قسم کی کوئی کتاب! شرم سے کٹا جا رہا ہوں کہ لوگ مجھے عالم، مفسر اور خدا معلوم کیا کیا سمجھ رہے، یہاں تو ان کی آدھی دعائیں بھی نہیں یاد ان کا ورد سفر تک میں رکھنا الگ رہا یہاں تو یاد بھی نہیں، یہاں انتظار کہ نواب کا خشوع و خضوع کچھ کم ہوئے تو ادہر

اہل دنیا کی زبان کچھ کہلے۔ مگر تو بہ اِس کا موقع ہی کیوں آئے
دعاؤں کا سلسلہ نہ ختم ہونا تھا نہ ہوا، یہاں تک کہ اِسٹیشن آگیا
ایک مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو مستثنٰی کر کے کسی لیڈر کی
چاہے وہ آل اِنڈیا ہوں یا صوبہ وار، مذہبی اعمال میں مصروفیت
کی ایسی مثال نہ تو اس سے قبل آنکھوں نے دیکھی ہے نہ
اِس کے بعد۔"

لیکن کیا صرف دعائیں ورد ہی کی حد تک تھیں؟ نہیں عمل بھی عین اس کے مطابق تھا، "مسکنی" کی دعا یونہی ریا کے لئے نہیں مانگتے تھے، سب جانتے ہیں کہ عالیشان عمارتوں میں، جگمگاتے کمروں اور اپ ٹو ڈیٹ فرنیچر پر بیٹھے امیروں کے ساتھ اِس بے تکلفی اور فراخ دلی سے کبھی گفتگو نہیں فرمائی جیسے غریبوں کے جھرمٹوں میں، چٹائیوں اور فرش مسجد پر بیٹھے ہنس ہنس کر اور دل کی پوری صفائی کے ساتھ فرماتے تھے، یہ امر محتاج دلیل نہیں کہ غریبوں سے مرحوم کو بڑا اُنس تھا، پھر بھی غیر نہ جاننے والوں کے لئے ایک ثبوت پیش ہے ــــــ مرحوم کے ہم محلہ ایک صاحب تفسیر میں پابندی سے شریک ہوتے تھے، ان کے لڑکے کی شادی ہوئی تو مرحوم کو دعوت نہ دی اسی خیال سے کہ نواب صاحب کی کیا خاطر ہو سکیگی، دوسرے روز جب تفسیر ختم ہو چکی تو مرحوم نے فرمایا، عبدالرحمٰن صاحب شادی مبارک، لیکن اپنے پڑوسی کو کیوں بھول گئے؟ ــــــ انھوں نے بڑی ہی خجلت سے فرمایا "نواب صاحب میں غریب آدمی، مجھ سے آپ کی کیا خاطر و تواضع ہو سکتی تھی، آپ کو خواہ مخواہ تکلیف ہی ہوتی" ــــــ بس اتنا سننا ہی تھا کہ چہرہ سرخ ہو گیا فرمانے لگے "اگر میں شریک ہوتا تو مجھے ذرا بھی تکلیف نہ ہوتی

لیکن آپ کے اس جملے نے مجھے اذیت پہنچائی۔" یہ تھا نوابیت اور امارت سے گریز اور رغبت سے اُنس، ہم نے کسی امیر کے ساتھ ایسی گفتگو نہیں سنی، ہاں، ایک دفعہ تو صدر اعظم تک کی دعوت کو مسلسل رد کرتے دیکھا۔

عشق رسول کی ایک صفت امت اسلامیہ کے لئے بے چینی اور گریہ وزاری ہے۔ مرحوم نے اس کو بھی اپنی زندگی کا طرۂ امتیاز پایا؛ سر اکبر حیدری کے دور وزارت میں جب حیدرآباد کی ریاست بھنور میں آچکی تھی اور مسلمانوں کا مستقبل تاریک دکھائی دیرہا تھا، وہ کس کی آنکھ تھی جو راتوں کے سناٹے میں اور صبح کے سہانے میں مسلسل اشکبار رہی؟ وہ کس کا سر تھا جو دارالسلام کے وسیع قطعہ اراضی کی خریدی پر سجدہ میں گر پڑا؟ اور کس کی آنکھ تھی اور کس کا دل تھا جو رو رو کر مچل مچل کر بارگاہ رب العزت میں فریاد کر رہا تھا کہ پروردگار اس زمین کو مسلمانوں کی فلاح کا ذریعہ بنا؟ مصیبت اور راحت کے موقعوں پر اس طرح رونا سنت نبوی ہے۔ اور اسی رونے میں حقیقی ہنسی پوشیدہ ہے۔ مرحوم کے یہ الفاظ زرین حروف میں لکھے جانے کے لایق ہیں کہ:-

"جب سے مسلمانوں نے راتوں کو رونا چھوڑ دیا،
دن کو ان کی ہنسی بیماروں کی سی ہنسی معلوم ہوتی ہے۔"

سیرت طیبہ کا ایک اہم پہلو اپنوں اور پرایوں کے ساتھ حسن سلوک ہے، مرحوم نے اپنی زندگی سنوارنے میں اس پہلو پر بھی پوری توجہ ملحوظ رکھی اس کی تفصیلات "کردار" کے باب میں "حسن سلوک" کے عنوان کے تحت آئیں گی۔

جہاں تک اپنی ذات کا تعلق تھا مرحوم نے سیرت محمدی پر عمل پیرا ہونکیا

امکانی کوشش فرمائی۔ ذاتی معاملات میں عفو، درگذر مرحوم کا نمایاں وصف تھا، یہ عشق رسول ہی کا تو نتیجہ تھا کہ روزانہ کی ڈاک میں جو گالیوں کے متعدد گم نام خطوط آتے، ان کو ایک ایک کرکے شروع سے اخیر تک پڑھتے کہ شاید کوئی کام کی بات یا کوئی بجا اعتراض نکل آئے! اور اس قسم کی تحریروں سے نہ کبھی برگشتہ خاطر ہوتے نہ مایوس ــــــ اور اگر کوئی کھلے بندوں اعتراض کرتا اور علی الاعلان ان کا عیب بتاتا تو اس کے انتہائی مشکور و ممنون ہوتے تھے، اکثر اپنی زیادہ تعریف و تحسین سے ناراض ہوجاتے بعض دفعہ تو ایسی حرکات پر لوگوں کو ڈانٹ بھی دیا کہ اگر واقعی میری وقعت تمہاری نظروں میں ہے تو اس کا عملی ثبوت پیش کرو اس لفاظی سے کیا حاصل۔

یہ کس بات کا نتیجہ تھا کہ جو ان کی بدخواہی کرتا، اس کے لئے بھی نیکی کی دعا، فرماتے؟ کوئی شخص اگر خوش کرنے کی خاطر ان کے مخالفین کی عیب جوئی کرتا تو ڈانٹ کر خاموش کر دیتے؟ یہ سب اسی عشق رسول ؐ کے کارنامے تھے ــــــ ایک دفعہ تقریر کرتے ہوئے مسلمانوں کو چند نصیحتیں فرمائیں اور، ان سے عمل کے وعدے لئے۔

قاید ملت۔ مجلس سے کامل وابستگی کا عہد کرو۔

مجمع - ہم عہد کرتے ہیں۔

قاید ملت۔ مجلس کے احکام کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھاؤ۔

مجمع - ہم وعدہ کرتے ہیں۔

قاید ملت۔ مجلس کے خلاف جو غلط فہمیاں پیدا کی جا رہی ہیں، جب موقع ملے ان کو رفع کرو، کیونکہ زبان کے سوائ

اب ان غلط فہمیوں کے رفع کرنے کا کوئی دوسرا ذریعہ ہمارے لئے باقی نہیں رہا ہے۔

**مجمع** ۔ ہم وعدہ کرتے ہیں۔

**قاید ملت** ۔ جو تم سے بچھڑ گئے ہیں ان کو برا نہ کہو (مراد مشائخین کی جماعت) بلکہ کوشش کرو کہ وہ پھر مجلس سے وابستہ ہو جائیں۔

**مجمع** ۔ ان پر لعنت بھیجو۔

**قاید ملت** ۔ خبردار میں اس کو بہت بُرا سمجھتا ہوں، میں آقائے دوجہاں کی اتباع میں دُعا کرتا ہوں کہ اللھم اھد قومی فھم لا یعلمون۔

یہ ہے حقیقی محبت اور الفت کہ محبوب کی ایک ایک ادا کو اپنے لئے شمع ہدایت بنایا جا رہا ہے۔ اس کے ایک ایک اشارہ سے اپنے عمل کو سنوارا جا رہا ہے۔

مرحوم کا خیال تھا اور بجا خیال کے سیرت طیبہ پر غائر نظر ڈالے بغیر قرآن کی حقیقی فہم حاصل نہیں ہو سکتی، حضرت امام ابن تیمیہ بھی تو اسی کے قایل تھے اور سیرت کو اتنی ہی اہمیت دیتے تھے۔ ــــــ مرحوم کی ہمیشہ یہ نصیحت رہی کہ :۔

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست

---

# مکمل کردار کا اعلیٰ نمونہ

"کردار ہی قسمت ہے"۔ زبان انگریزی کی مشہور ضرب المثل، اور حقیقت کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے۔ ایک سفید کپڑے کو جس رنگ میں ڈالا جائے گا وہی رنگ اختیار کرے گا، یہ تو ممکن نہیں کہ سیاہی میں ڈبوئیں اور سرخ یا سبز ہو جائے۔ آفرینش کے اعتبار سے ہر انسان فطرت کی پوری سادگی کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ ماحول، تعلیم و تربیت جیسے موثرات اس کو کافر یا مسلمان خوش اخلاق یا بد تہذیب اور مولوی یا جنٹلمن بنا دیتے ہیں، یہ چیز حدیث سے بھی ثابت، اور مشاہدہ بھی اس کا گواہ ہے۔ اِسی لئے ہر مذہب نے انسان کے اعمال و اخلاق کی درستی کی کوشش کی، اور دین محمدی کا تو یہ طرۂ اِمتیاز ہے کہ وہ اعلیٰ ترین اخلاقی اقدار کا

حامل ہے۔ محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعریف کن الفاظ میں ہوئی؟ اِنک لعلیٰ خلق عظیم؛ یعنی آپؐ خلقِ عظیم کے حامل ہیں، لہٰذا ہر مسلمان کو اس کے حصول کی ممکنہ کوشش ضروری ٹھیری، جس نے یہ نعمت حاصل کر لی اس کا ستارہ چمک اٹھا اور جس نے اِدھر سے بے توجہی برتی اس کی قسمت پھوٹی۔

**حسنِ سلوک** مرحوم قائدِ ملتؒ نے اپنے اخلاق و کردار کے سنوارنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی، مسلمان اور غیر مسلمان سب ہی ان کے اعلیٰ کردار کے مداح تھے، کردار کا پہلا وصف "حسن سلوک" ہے معاشرہ میں وہی شخص سب سے زیادہ مقبول ہوتا ہے جو اپنے معاملات میں بہت سیدھا ہو، اسی وجہ سے مذہب اسلام میں معاملات پر بہت زور دیا گیا ہے اور یہ دائرۂ عبادت سے خارج نہیں رکھے گئے، بلکہ اگر کوئی شخص محض نماز روزہ کی پابندی کر کے اپنی نجات کے خواب دیکھتا ہو اور اس کے معاملات اپنے اقارب، پڑوسیوں اور شہریوں کے ساتھ استوار نہ ہوں تو اس کے خواب کی تعبیر الٹی ہی بتائی گئی ہے —— مسلمانوں کی بدبختی ہے کہ انمیں اکثر لوگ معاملات ہی کے کچے ہیں۔

مرحوم کو جب گھر کی سرداری ملی اور بڑے فرزند ہونے کی حیثیت سے جاگیر کی عنان ان کے ہاتھوں میں آئی تو سب سے پہلا کام یہی کیا کہ اپنے دو چھوٹے بھائیوں کے حصے محفوظ فرمائیے، ان کی تعلیم و تربیت کے تمام سامان فراہم کئے اور بڑے ہونے پر ہر ایک کو اس کا حصہ دے دیا، اِسیطرح دیگر اقربا کی بھی امداد فرمائی، شرعی اعتبار سے جو زکوٰت نکلتی تھی، ادا کرنے لگے یتامیٰ اور غربا کے حقوق پورے کئے۔ غرض اپنے اس طرزِ عمل سے گھر میں اور محتاجوں میں خوشی و مسرت کی ایک لہر دوڑا دی۔

مرحوم کے والد نے ۵ لاکھ کا جو قرض چھوڑا تھا، اس کی پائی پائی ادا کردی اور آئندہ کے لئے اس برائی کی جڑیں کاٹ دیں، جن سے بھی مالی تعلقات رہے سب کے ساتھ نہایت دیانت دارانہ اور منصفانہ سلوک روا رکھا، ورنہ اکثر لوگ اپنی بزرگی اور خاص حیثیت سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

غریب طلبہ کے لئے وظائف دیتے تھے اور بعض غریب لڑکوں کو اپنے ہاں رکھتے اور ان کی تعلیم و تربیت کا خیال فرماتے تھے طلباء کی ہمت افزائی اور دین کی طرف رغبت دلانے کے لئے تاریخ اسلام میں درجہ اول و دوم آنے والوں کو انعامات بھی عطا فرماتے تھے، اسی طرح اچھی تقریر کرنیوالوں کی بھی ہمت افزائی فرمایا کرتے تھے۔ —— بعض طلبہ جو حصول تعلیم کی غرض سے علیگڑھ وغیرہ جانا چاہتے ان کو قرض حسنہ بھی عنایت فرماتے تھے، اور یہ قرض کیا ہوتا دراصل دے ہی دیتے تھے، طرز یہ تھا کہ جب کوئی طالب علم اس طرح کی درخواست کرتا تو اس کے چہرہ بشرہ ہی سے تاڑ جاتے کہ واقعی اس میں تعلیم کا ذوق بھی ہے؟ اور اس میں مرحوم کو مہارت حاصل تھی، —— پھر کسی اور وقت اس کو طلب فرماتے، جب یہ یقین ہو جاتا کہ واقعی اس میں حصول علم کی تڑپ ہے تو سو دو سو روپیہ یہ کہہ کر دیتے کہ "عجلت نہ کرنا، جب تمہیں اللہ تعالیٰ فراخی دے تھوڑا تھوڑا کرکے ادا کر دینا" دراصل نیت لینے کی ہوتی ہی نہ تھی، ورنہ صرف زبانی جمع و خرچ پر اکتفا کیوں فرماتے؟

مسلمانوں کے ساتھ تو مرحوم کا جو برتاؤ رہا اس کی پچاسوں مثالیں اکثر حیدرآبادی بلکہ باہر والے بھی جانتے ہی ہیں، لیکن مرحوم کا یہ احسان غیر مسلموں کے ساتھ بھی ویسا ہی تھا —— حیدرآباد کے مشہور بیرسٹر سری کشن تھے، جو مرحوم کی حیات میں بھی ان کی شخصیت کے بہت زیادہ

معترف تھے، تعزیتی تقریر کرتے ہوئے دارالسلام کے وسیع میدان اور کثیر اجتماع میں مرحوم کی اس صفت پر خاص روشنی ڈالی تھی۔ بیرسٹر صاحب کہتے تھے کہ مجلس اتحاد المسلمین کے اثر کی بڑی وجہ نواب صاحب مرحوم کی ذات اور ان کا وسیع حسن سلوک تھا؛ ویسے تو غیر مسلموں کے ساتھ داد و دہش کی بہت سی مثالیں پیش کی گئی لیکن اختصار کے مد نظر صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے، بیرسٹر صاحب نے فرمایا کہ ایک مرتبہ ایک ہندو نے ان کے آگے اپنی داستان سنائی کہ وہ بارہ سو (۱۲۰۰) کا مقروض تھا، اور کسیطرح قرض ادا ہی نہ کر سکا، حتیٰ کہ ڈگری آئی اور قریب تھا کہ اس کی املاک کے ہراج کے ساتھ اس کی عزت کا بھی بیع ہو جاتا، چونکہ غریب آدمی تھا، اس کی کوئی مدد کرنے والا اور غمگسار نہ تھا۔ یکایک خیال آیا کہ اب بہادر یار جنگ ہی سے معروضہ کرنا چاہیئے ورنہ پھر جو مقدر میں ہے ہو کر رہے گا۔ دوڑا ہوا پریشان پریشان مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا اور بہت ہی لجاجت سے اپنی آبرو کی حفاظت چاہی، مرحوم نے اس کے چہرہ پر حقیقی پریشانی اور شرافت کے آثار پڑھ لئے فوراً بارہ سو (۱۲۰۰) کا ایک چیک لکھ دیا اور فرمایا "جاؤ قرض ادا کر دو اور جیسے بن پڑے آہستہ آہستہ یہ رقم ادا کر دینا"——

اس قسم کی مثالوں سے مسٹر سری کشن بیرسٹر نے یہ ثابت کیا کہ در اصل مرحوم نے ہندوؤں کے قلوب کو بھی مسخر کر لیا تھا، اور مرحوم کی شرافت و ہمدردی اور بلاتفریق مذہب انسانی عظمت کی قدر دانی کا اثر یہ تھا کہ سب ان کے احسان سے دبے ہوئے تھے،—— حسن سلوک کا کیسا صحیح اور اعلیٰ نمونہ ہے! اسلام کی کیسی عظمت و برتری ظاہر ہوتی ہے: انہی اعلیٰ اخلاق کی وجہ سے تو قرن اولیٰ میں دیکھتے ہی دیکھتے شجر اسلام کی شاخیں

دور دور تک پھیل گئیں اور لوگوں نے محسوس کیا کہ اسی کا سایہ صحت بخش ہو سکتا ہے!!
—— پھر سلوک بھی کیسا خفیہ، ریا کا کوئی شائبہ، دکھاوے کی کوئی ادنیٰ جھلک بھی ہے؟ ہزاروں عوام نہیں، سیکڑوں رات دن ملنے والوں کو تک اس ہاتھ کی خبر نہ تھی! جب گزر گئے تو بھید کھلا کہ علانیہ دینے والا ہاتھ خفیہ طور پر بھی بے دریغ لٹاتا تھا۔ اور کیا یہ سب کچھ ناموری کے لئے، اپنی بڑھائی جتانے کے لئے تھا؟ اگر ایسی نیت ہوتی تو وفات کے بعد یہ راز نہ کھلتے! حیات میں کون جانتا تھا کہ سیکڑوں بیوائیں اور معذور بہادر خاں کے ذریعہ پل رہے تھے، کسے پتہ تھا کہ دین کے اعلیٰ معیار کی حفاظت اور اغیار پر اس کا سکہ جمانے کے لئے غیر مسلموں کے ساتھ بھی یہ سلوک ہو رہے تھے! حسن سلوک کی ایسی اعلیٰ مثالیں بہت کم پائی جاتی ہیں۔

حسن سلوک کا تعلق محض روپیہ پیسے کی حد تک نہیں بلکہ گفتگو اور میل جول بھی اسی سے متعلق ہیں۔ مرحوم کی عادت تھی کہ دوست ہو یا اجنبی، اپنا ہو یا پرایا سب کے ساتھ سلام میں پہل فرماتے، عشق فاروقی ؓ کے چند ظاہرہ اثرات میں سے یہ بھی ایک تھا کہ سلام میں تقدیم ہمیشہ ادھر ہی سے ہوتی، پھر اگر ایک ہی محفل میں کئی اصحاب موجود ہوں تو طرز خطاب ایسا رہتا کہ ہر ایک خود ہی کو زیادہ مخاطب پاتا، ہر ایک کے دل میں گمان کیا بلکہ یقین پیدا ہو جاتا کہ مجھ پر نظر کرم زیادہ ہے،" خلق عظیم" کا یہ بھی ایک پرتو ہے؛

اللہ رے چشم یار کی معجز بیانیاں
ہر ایک کو ہے گماں کہ مخاطب ہمیں رہے

یہی وجہ تھی کہ جو اس بزم سے نکلتا، سرشار اور دل میں مرحوم کی عظمت کے

گہرے نقوش لئے ہوئے ــــــ پہلے تو ذاتی کشش، اندازِ گفتگو اور طرزِ تبسم ہی کیا کم تھا، اس میں اِس صفت نے اور بھی تاثیر پیدا کر دی تھی، غریب سے غریب مِلتا تو انہی کو اپنا مونس و غم خوار سمجھتا، عالم شاعر یا اور کوئی ماہر فن گفتگو کرتا تو انہی کو صحیح قدر دان تصور کرتا، مالدار کا دل کبھی پسیجتا اور انفاق پر تیار ہو جاتا تو انہی کے کردار اور گفتگو کی وجہ سے ــــــ غرض ہر ایک کے لئے اپنے اندر پوری کشش اور جاذبیت رکھتے تھے۔

**حق پسندی** بعض کم فہم ہر ایک کے سامنے منہ دیکھی باتیں کر کے سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے خوش اخلاق ہیں، اخلاق کا یہ معیار اپنی کوئی بنیاد نہیں رکھتا، اخلاق کی شرطِ اوّلین "حق پسندی" اور "حق گوئی" کی صفت ہے، اگر کچھ دنوں یہ دورویہ روش چل بھی جائے تو بہت جلد بھانڈا پھوٹ کر رہتا ہے اور پھر ایسا اِنسان کسی کے نزدیک بھی قابلِ اِعتماد نہیں رہتا، سیرتِ طیبہ کا ایک اہم باب حق پسندی ہے بلکہ سب سے اہم ہی باب ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کفار امانتیں کیوں رکھاتے تھے؟ باوجود مخالفت کے "امین" کے لقب سے کیوں یاد کرتے تھے؟ اسی حق پسندی کی وجہ سے؛ اور ایک حق پرست حق پسند نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا، اور اگر حق پسندی اس سے جاتی رہے تو حق پرستی کہاں باقی رہ جاتی ہے۔

مرحوم پر عوام، حکومت اور ہندو سب اسی وجہ سے کامل اِعتبار رکھتے تھے کہ ان کے دل و زبان میں گہری رفاقت تھی، جو دل میں ہوتا، اس کے اظہار سے کبھی نہ چوکتے تھے، بعضوں نے ان کی اس صفت کو سیاست کے خلاف کہا۔ اور ہو گی بھی سیاستِ حاضرہ کے خلاف، لیکن جب پر "حق" کی سیاست مُسلط تھی اس سے کیوں ایسی توقع کی گئی؟ ــــــ گلبرگہ کا واقعہ ہے کہ ایک

مندر اور مسجد قریب قریب ہونے کی وجہ سے درمیانی زمین کا جھگڑا تھا، مسلمان اسے اپنی ملک بتاتے تھے اور ہندو اس کو اپنی مقبوضہ کہتے تھے، سرکاری حکام کو بھی اس معاملہ میں ہاتھ ڈالتے ہوئے جھجک محسوس ہوئی، کیونکہ بہ ہر طور جھگڑے کے امکانات قوی تھے، حکومت نے مرحوم سے خواہش ظاہر کی کہ اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لیں اور تصفیہ فرمائیں۔ مرحوم گلبرگہ گئے تمام واقعات کا معائنہ فرمایا دونوں فریقوں کے بیانات سنے، اور چونکہ ہندوں کا کیس زیادہ قوی پایا گیا، لہٰذا تصفیہ ہوا کہ زمین انہی کو دے دی جائے، حکومت نے احکام جاری کر دیئے اور زمین ہندوؤں کو مل گئی ——— مسلمانان گلبرگہ جو مرحوم کی سب سے زیادہ قدر کرتے اور اپنی محبت کا عملی ثبوت دیا کرتے تھے، جس کے خود قائد ملت بھی معترف تھے، برگشتہ ہو گئے کہ قائد ملت نے مسلمانوں کے خلاف فیصلہ کیوں کر دیا؟ شاید انھوں نے مرحوم کو ایسا قائد سمجھ رکھا تھا جو جائز و ناجائز ہر طرح انہیں کو فایدہ پہنچاتا، جس کی سیاست کا مدار جنگیزیت پر نہیں بلکہ حقانیت پر تھا اس سے ایسی توقع رکھنا کیسی فاش غلطی تھی؟ مرحوم کو پتہ چلا کہ نوجوانان گلبرگہ خصوصاً اور عام مسلمان عموماً، مرحوم کے اس تصفیہ سے سخت ناراض ہیں تو ایک بیان شائع کروایا، جس میں اس بات پر زور دیا کہ مسلمان حق پسند اور حق شناس ہوتا ہے، عدل اس کا اعلیٰ ترین وصف ہے، اور اپنے اس بیان کی تائید میں قرآن مجید کا یہ حکم نقل فرما دیا۔ یا ایھا الذین اٰمنو کونوا قوامین للہ شھدآء بالقسط ولا یجرمنکم شناٰن قوم علیٰ الا تعدلوا، اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ۔ واتقوا اللہ، ان اللہ خبیر بما تعملون ہ [ ترجمہ۔ اے ایمان والو اللہ تعالیٰ کے لئے پوری پابندی کرنے والے اور انصاف کے ساتھ شہادت ادا کرنے والے

رہو اور کسی خاص لوگوں کی عداوت تم کو اس پر باعث نہ ہو جائے کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کیا کرو کہ وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی پوری اطلاع ہے۔]

اَب کون ہے ایسا حق پرست جو مسلمانوں کو سیدھی سیدھی اور صحیح قرآنی راہ بتائے؟ کون ہے جو اسلامی تعلیمات کو اس شدت کے ساتھ پیش نظر رکھکر قیادت کے منصب جلیلہ پر فائز رہے؟ کون ہے جس کا مقصود نہ ہندوؤں کی دل شکنی ہو نہ مسلمانوں کی دلجوئی بلکہ صرف رضائے الٰہی کا حصول ہو؟ ـــــ ذرا کوئی صحیح فہم کا انسان سوچے تو کہ اس عدل کا کافروں پر کیا اثر پڑتا ہے، یہی صفات تو تھے جن کی بنا پر غیر مسلمین بھی مسلمانوں کی سلطنت میں رہنا پسند کرتے تھے، تاریخ آج بھی اپنا ورق الٹ سکتی ہے بلکہ الٹنا چاہتی ہے، لیکن ضرورت اس کی ہے کہ مسلمان پھر ایک بار "حبل متین" کو تھام لیں اور "حق" کو اپنا مقصود قرار دے لیں۔

یہ قومی اعتبار سے ایک مثال ہوئی۔ ذاتیات میں بھی مرحوم کی حق پسندی ایسی ہی شدید تھی، ان کے کسی فعل کو کوئی شخص غلط ثابت کر دکھاتا تو فوراً تسلیم کرلیتے تھے، یہ نہ دیکھتے تھے کہ کہنے والا دوست ہے یا دشمن، اپنا ہے یا پرایا، چھوٹا ہے یا بڑا، نہ اس کی پروا تھی کہ قیادت کے مقام پر فائز رہ کر غلطیوں کا ایسا اعتراف مصلحت کے خلاف ہوگا، مرحوم کی اس صفت کے دوست اور دشمن یکساں مداح ہیں، پھر یہ اعتراف تنہائیوں میں نہیں، برملا ہزاروں کے مجمع میں ہوتا ـــــ اصل بات یہ تھی کہ نہ قیادت حاصل کی گئی تھی نہ خود کو قاید سمجھتے تھے، بس وہاں تو ہر آن فکرِ عاقبت تھی، ہر کام اس وجہ سے کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے صلاحیتیں دے رکھی

تھیں اُن سے لوگوں کو فایدہ نہ پہنچاتے تو مواخذہ کا قوی اندیشہ تھا، اسی وجہ سے جہاں اپنی کم علمی اور کم تجربہ کا اقرار تھا وہاں اپنی اِنتظامی اور قایدانہ صلاحیت کا بھی انکار نہ فرماتے تھے۔ اس کا اندازہ اس گرانمایہ خط ہی سے ہو چکا ہوگا جو اصل سوانح سے پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ —— ہوا یہ تھا کہ مولانا محمد علی لکچرار شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ نے مرحوم سے فرمایا کہ ہم بحیثیت ملازم سرکار، کسی تعمیری کام میں تو حصہ نہیں لے سکتے، البتہ ایک تخریبی کام کے لئے حاضر ہیں مرحوم نے پوچھا وہ کیا ہے؟ فرمانے لگے "مذہبی نقطۂ نظر سے آپ کے اِنفرادی و اجتماعی اعمال پر تنقید کیا کریں گے"۔ —— اِس پر مرحوم بے حد خوش ہوئے، اور اسی وقت سے یہ خط و کتابت ہوتی رہی —— بہرحال یاد تازہ کرنے کے لئے حسب موقع اِسی خط کے چند جملے درج ذیل ہیں:۔

> "پہلے اجازت دیجے کہ اپنا بے لاگ جائزہ لوں جس میں نہ انکسار ہو نہ تعلی شاعرانہ۔ میری قابلیت علمی چاہے علوم دینیہ و السنۂ مشرقیہ سے متعلق ہو چاہے علوم حدیثۂ مغربیہ کی نسبت، بہت سطحی اور صرف بقدر ضرورت ہے۔ اِنکساراً نہیں حقیقتاً گنہگار ہوں اور اسی روحانی طاقت اور تقویٰ کی قوت سے بے بہرہ جو ایسے عزائم رکھنے والے کے لئے درکار ہے۔ لیکن قوم کی اِجتماعی فکر کو سمجھنے اور اس سے کام لینے کی بے پناہ صلاحیت قدرت نے مجھے عطا فرمائی ہے، اور صرف یہی صلاحیت میری اس وقت تک کی کامیابی کا راز ہے"۔

تصنع سے کیسا گریز اور حق پسندی کی کتنی اعلیٰ مثال ہے، ورنہ اکثر دیکھا

گیا ہے کہ انکسار کے جامہ میں بھی غرورہی کا پیکر چھپا رہتا ہے۔

مرحوم اکثر فرمایا کرتے تھے "پچاسوں در کی جبہ سائی چھوڑ کر انسان صرف ایک بارگاہ کی ناصیہ فرسائی کرنے لگ جائے تو ساری کائنات اسکی ہوجائے گی، پچاسوں کو خوش کرنے کی کوشش، ایک کو بھی راضی نہ کرسکیگی"۔ توحید اور وحدانیت کا یہ درس قولاً نہیں فعلاً دیا گیا، مرحوم شاید ہی کوئی بات ایسی کہتے تھے جس پر عمل نہ فرماتے تھے، ویسے تو ان کی زندگی کے بیسیوں واقعات اور بہ حیثیت مجموعی کل زندگی موحدانہ عمل سے بھری پڑی ہے لیکن یہاں بھی موقع کے اعتبار سے ایک واقعہ یاد آتا ہے —— ایک دفعہ "درس اقبال" ختم ہوچکا تھا، نماز مغرب کا وقت بھی آپہنچا، مرحوم اور دوسرے سامعین نماز کے لئے صحن (گرمی کی وجہ سے "بیت الامت" کے صحن ہی میں نماز کا انتظام تھا) کی طرف بڑھنے لگے، ایسے میں "معلمین درس اقبال" میں سے ایک صاحب جن کو نواب صاحب بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور محبت بھی فرماتے تھے اپنے گھر کا رُخ کرنے لگے، بہادر کی حمیت اسلامی جوش میں آگئی، چہرہ غصہ سے سرخ ہوگیا کڑک کر کہا "جناب نماز کا وقت ہوچکا اور آپ کدھر جارہے ہیں؟ اگر آئندہ سے نماز پڑھنے کا ارادہ نہیں تو میرے گھر میں قدم رکھنے کی ضرورت بھی نہیں، آپ کی ہماری دوستی کس کے لئے ہے؟" لوگ حیران تھے کہ نواب صاحب کس کو ڈانٹ رہے ہیں، ایک آل انڈیا بلکہ آل ورلڈ (عالمی) شہرت رکھنے والی ہستی کو؟ اس کو جس سے ابھی کہہ رہے تھے کہ آپ ہی درس دیجے میں تو اساتذہ میں سے نہیں، طالب علموں میں سے ہوں! اللہ رے حق پسندی نہ دوستی کی پرواہ نہ کشیدگی کا رنج، لیکن کشیدگی پیدا کہاں ہوئی؟ وہ صاحب گردن جھکائے خاموش کھڑے رہے اور آئندہ سے اپنی اصلاح کرلی اور وہی تعلق خاطر رہا جو

پہلا تھا۔ حق کی خاطر دنیا کو ٹھکرانے سے دنیا بھی جاتی نہیں رام ہو کر پابوسی کرتی ہے! صرف استقامت اور حقانیت درکار ہے۔

اس قسم کا ٹکراؤ افراد سے نہیں جتھوں سے بھی ہوا، مشائخین دکن بعض فروعی اختلاف کی بنا پر مجلس سے الگ ہو چکے تھے، انھوں نے دو پارٹیاں بنائیں کیونکہ خود آپس میں بھی پھوٹ پڑ گئی تھی، ایک مجلس علمائے دکن کہلائی دوسری مجلس مشائخین دکن رجسٹرڈ کے نام سے موسوم کی گئی، مشائخین دکن رجسٹرڈ کی طرف سے ایک جلسۂ عام کیا گیا اور اس میں قاید ملت کو بھی دعوت تقریر دی گئی، مرحوم نے قبول کر لی، اخبار میں جیسے ہی اس جلسے کا اعلان شائع ہوا مختلف لوگ آآکر مرحوم سے پوچھنے لگے کہ" آپ ان کے جلسہ میں تقریر کیوں فرما رہے ہیں؟ ان سے مجلس اتحاد المسلمین کو کافی نقصان پہنچا، اور باوجود آپ کی مسلسل کوشش کے انھوں نے اپنی روش نہیں بدلی!"—— مرحوم نے ہر ایک سے مسکراتے ہوئے یہی فرمایا" ہاں میں نے سب کچھ جانتے ہوئے دعوت قبول کی ہے"—— جلسہ کی تاریخ آئی ہزاروں مسلمان زمرد محل ٹاکیز کے وسیع ہال میں جمع ہو گئے، جلسہ شروع ہوا، قاید ملت کی باری آئی، سبھوں کی نظروں سے تعجب اور غور کے آثار برس رہے تھے کہ دیکھیں کیا فرماتے ہیں،—— محمد بہادر خاں جو غیاب میں کبھی کسی کے متعلق دو لفظ بھی نہ فرماتے تھے، ہزاروں کے مجمع میں حق گوئی پر تل گئے اپنی کم علمی اور ناواقفیت کا اقرار کیا لیکن ان کے طرز عمل کی بھی دھجیاں بکھیر دیں اعلان کیا کہ" میرا مقام قیادت کا نہیں" لیکن سنا دیا کہ" کوئی بڑھ کے اس مقام کو حاصل کیوں نہیں کر لیتا؟ یہ مقام میں نے لیا نہیں بلکہ عام مسلمانوں نے عطا کیا ہے!"۔ غرض گھنٹہ بھر اسی قسم کی تقریر فرمائی، عام مسلمان مطمئن ہو گئے،

بانیان جلسہ میں سے حق پسندوں کے دل کو بات لگی، اب یہ سوال یہاں اُٹھانا بیکار ہے کہ یہ احساس کتنوں میں عملی شکل اختیار کر گیا!

اسیطرح یوم "سیزدہ صد سالہ یادگار امام حسین رض" کے اجلاس ہوئے، سنی اور شیعہ کے مشترکہ جلسے تھے، تین روز تک ہوتے رہے اور بڑے ہی شاندار پیمانہ پر ہوئے۔ تیسرے روز کا جلسہ قایدِ ملت کی صدارت میں تھا، مجمع گذشتہ دو دنوں سے کہیں زیادہ تھا، قایدِ ملت نے اپنا پرمغز خطبہ صدارت سنایا (جو اسی سال اخبار "رہبرِ دکن" اور "صدق" کے صفحات میں شایع بھی ہوا) اس کے بعد دوسری تقریریں شروع ہوئیں، لوگ ایک ایک کر کے کھسکنے لگے، شہید یار جنگ صدر استقبالیہ تھے، فرمانے لگے "نواب صاحب آپ کی تقریر ہو چکی اب لوگ کیوں ٹھیریں گے! بہتر ہوتا آپ اخیر میں تقریر فرماتے"۔ مرحوم نے اعلان کیا کہ اخیر میں بھی تقریر فرمائیں گے، اٹھتے ہوئے بیٹھ گئے اور جاتے ہوئے لوگ لوٹ آئے، جب سب تقاریر ختم ہو چکیں تو شیر دل قاید نے اٹھکر مسلمانوں کے فرقہ وارانہ افتراق کی پول کھولنی شروع کی، پہلے سنیوں کو ڈانٹا پھر شیعوں کو لتھاڑنا شروع کیا "علی رض کی محبت کا دعویٰ کرنے والو ویسا عمل بھی کر دکھاؤ" اور اب تاریخ کے حوالے شروع ہوئے کہ حضرت عثمان کے پہرے کے لئے حضرت علی نے کن ہستیوں کو مقرر کیا تھا؟ یہ کس نے کہا تھا کہ "عمر رض تم نے اپنے بعد اور کسی کو ایسا نہ چھوڑا کہ اس جیسا عمل کر کے مرنا مجھے محبوب تر ہوتا؟ تمہارا ہی سا عمل کر کے خدا تعالیٰ سے ملنا مجھے پسند آتا ہے"۔ وغیرہ تین روز سے مسلسل تقریریں ہوتی رہیں کسی کی زبان ان حقائق پر کھلی؟ کسی کی جرأت ہو بھی سکی کہ حق کا انکشاف کرے؟ لیکن آخر اسی مردِ مجاہد "سیف الاسلام" نے حق گوئی اور حق پسندی کا ثبوت دیا، دل میں تو نہ جانے کتنوں کے یہی خیالات

ہوں گے لیکن ایک کی زبان نے بھی دل کی رفاقت نہ کی، یہ رتبہ تو ایسے ہی قلندروں کے لئے ہے۔

ہزار خوف ہو لیکن زبان ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

---

**بذلہ سنجی** "زاہد خشک" کی اصطلاح اس قدر مشہور ہو گئی ہے کہ "زاہد" اور "خشک" ہم معنی الفاظ بن گئے ہیں، جہاں "زاہد" کا ذکر ہو ذہن میں خشکی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جہاں "خشکی" آ گئی تو "زاہد" کا گمان ہونے لگتا ہے۔ حالانکہ یہ صرف شاعری ہے۔ زاہد اصول فطرت کا سب سے زیادہ پابند، خشکی کو اس کے ہاں کیا دخل؟ ہاں تمسخر اور ٹھٹھا مذاق نہیں ہوتا، لطیف مسکراہٹیں اور فطری شوخی اس کے سوا اور مل کہاں سکتی ہے!

مرحوم قاید ملت زاہد تھے اور بڑا ہی لطیف مزاج پایا تھا، ان کی محفل میں بیٹھنے والے جانتے ہیں کہ ظرافت کی ایسی اعلیٰ شراب کسی اور میکدہ میں پلائی نہ جاتی تھی اور بذلہ سنجی کے ایسے لبریز سبو کسی اور محفل میں لنڈھائے نہ جاتے تھے، ——— خوش خلقی مرحوم کا خاص وصف تھا، لیکن جس طرح مرحوم کا علمی مذاق بہت اعلیٰ اور ان کی زندگی عام لوگوں سے زیادہ ارفع تھی، انکی بذلہ سنجیاں بھی ایک خاص معیار رکھتی تھیں۔ ان سے پورے طور پر وہی محفوظ ہو سکتے ہیں جو مذاق کا ایسا ہی اعلیٰ معیار رکھتے ہوں۔ بہت کم ایسا ہوتا بلکہ ہم نے تو کبھی سنا ہی نہیں کہ ان کی مذاحیہ گفتگو میں کوئی کام کی بات نہ ہو۔ ہر مزاح میں ایک آدھ حقیقت کی طرف اشارہ اور ایک آدھ برائی پر لطیف طنز ضرور ہوتا تھا ———

بلادِ اسلامیہ کے سیر کے سلسلہ میں ساحلِ اٹلی سے گزر رہے تھے، مرحوم کے ایک اِیٹالین (اٹلی کا باشندہ) دوست بھی ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے — یہ جہازی کی دوستی تھی — انھوں نے دیکھا کہ شام ہوتے ہی تو یہ شخص (قائدِ ملت) صرف شیروانی اتارتا ہے اور سو جاتا ہے، صبح اُٹھتا ہے تو پھر انہی کپڑوں پر شیروانی پہن لیتا ہے۔ رہا نہ گیا، کہنے لگے "ہندوستانی واقعی بہت پیچھے Backund ہیں، ان کو لباس کا اِستعمال تک معلوم نہیں اور نہ ان کا لباس اچھا ہے"۔ مرحوم نے مسکراتے ہوئے پوچھا "اچھا تم ہی بتاؤ کہ اچھے لباس کے لئے کیا شرائط ضروری ہیں؟" اس پر وہ صاحب سٹپٹائے اور کہنے لگے "جی، آپ ہی فرمائیں" — مرحوم فرمانے لگے:۔ دیکھو بھئی، لباس ایسا ہو۔

(i) جس سے موسمی اثرات سے محفوظ رَہ سکیں؛

(ii) اُٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے میں سہولت رہے اور۔

(iii) ساتھ ہی بھدا نہ ہو بلکہ خوش وضع ہو — اس لحاظ سے دیکھو تو میری شیروانی جو گلے سے گھٹنوں کے نیچے تک ہے، موسمی اثرات سے پورا تحفظ کرتی ہے، میرا پاجامہ میرے کسی طرح بھی اُٹھنے بیٹھنے اور لیٹنے میں مزاحم نہیں ہوتا، اور میرا لباس بہ حیثیت مجموعی خوش وضع بھی ہے البتہ — اس میں ایک نقص ہے، جو تمہارے لباس میں نہیں پایا جاتا وہ یہ ہے کہ اس سے اِنسانی جسم کی فطری تراش ظاہر نہیں ہوتی!" اس طنز اور حقیقت پر اِیٹالین صاحب اپنا سا منہ لیکے رَہ گئے۔

اسیطرح کا ایک لطیفہ ایران کا بھی ہے۔ مرحوم کو کسی مقام تک جانا تھا فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے کرایہ کی موٹر لینی پڑی۔ موٹر ڈرائیور سے پوچھا

کہ فلاں مقام تک پہنچانے کے لئے کیا لوگے؟ اس نے، جیسا کہ ان لوگوں کا بالعموم طرز ہوتا ہے، پوچھا "آپ کتنے ہیں؟" مرحوم کو مذاق سوجھا، فرمایا "ہم دو ہیں" اس نے جواب دیا کہ "فی کس اتنا اتنا کرایہ ہوگا" مرحوم فرمانے لگے "کرایہ تو ایک ہی شخص کا دونگا لیکن ہم چلیں گے دونوں" —— اس نے انکار کیا کہ "میں تو نہ لے جاؤنگا" مرحوم نے فرمایا "میں تو ضرور جاؤنگا اور صرف اپنا ہی کرایہ دونگا، ساتھی کا ایک حبہ بھی نہ دونگا —— یہی انکار و اصرار چلتا رہا، جب مرحوم نے دیکھا کہ اب وہ غصہ میں آچکا ہے تو ہنسکر فرمانے لگے "بڑے میاں! میں اور میرا اللہ ہم دو ہیں، کیا دونوں کا کرایہ لوگے؟ میرے ساتھ کون شخص تھا جو تم نے پوچھا کہ آپ کتنے ہیں؟" —— اسپر وہ شرمندہ ہوگیا اور اس قدر عزت و محبت کا ثبوت دیا کہ جیسے مرید ہی ہوگیا ہے۔

مدراس کا واقعہ ہے، جواہر لال نہرو اور مرحوم میں کچھ گفتگو ہو رہی تھی، پنڈت نہرو نے مذہب اسلام کی تعلیمات کو محدود بتانے کی لاحاصل کوشش کی، مرحوم فرمانے لگے —— "پنڈت جی! واقعی ہمارا مذہب بڑا محدود ہے، مذہب تو آپ کا ہے کہ پھیلے تو ارض و سما کی وسعت اور سکڑ جائے تو برہما کی ناک سے ٹپکا ہوا ایک برہمن!" —— پنڈت نہرو نے تعجب سے پوچھا "نواب صاحب میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا" فرمانے لگے "مطلب صاف ہے، تمہارا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد روح دوسرا جنم لیتی ہے، اچھے اعمال ہوں تو گائے اور برے ہوں تو کتے بلی وغیرہ کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے، تو مجھے کیا معلوم، ممکن ہے یہ کائن کائن کرتا ہوا کوا کوئی تمہارا بڑا آریٹر (مقرر) ہوگا، اسی طرح سارے حشرات الارض اور چرند پرند تمہارے ہی عزیز و اقربا ہوں گے —— رہی دوسری بات، تو وہ واضح ہے، عبادت

قیادت اور بزرگی برہمن کے سوا اور کسے نصیب ہو سکتی ہے؟

یہ تھے چند بذلہ سنجی کے اعلیٰ نمونے، اسی طرح مرحوم کی ہر مزاج میں کوئی نہ کوئی علمی بات ضرور ہوتی تھی، یہاں عامیانہ مذاق تو کبھی کسی نے دیکھا ہی نہیں

---

## تواضع

ز خاک آفریدت خداوند پاک
پس اے بندہ افتادگی کن چو خاک

نصیحت ہے عارف شیراز سعدی علیہ الرحمتہ کی، تواضع اور انکساری کو خاصۂ انسانی بتا رہے ہیں، مقصود یہ ہے کہ فخر، تکبر اور عجب "عبدیت" کے منافی ہیں، عبد کامل وہی ہے جس میں تواضع کا کمال ہو، اب جس میں جتنی افتادگی ہوگی، انکسار ہوگا، اتنا ہی زیادہ وہ اپنے مقام سے قریب تر ہوگا اور ایک مسلم تو بہر حال تسلیم کا خوگر ہوتا ہے، لا غالب الا اللہ کے تصور سے وہ اپنی بڑائی کو خاک کر دیتا ہے، اسی شکستگی سے اُسے قرب الٰہی اور رضائے الٰہی ملتی ہے، اور جس سے اللہ راضی ہو جائے، تو کائنات کا اس کے آگے جھک جانا کوئی مشکل بات ہے؟ ـــــــ یہی سربلندی کا راز ہے ـــــــ

محمد بہادر خاں نے اپنی زندگی سیرت طیبہ کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی تھی، اس لئے تواضع یہاں دکھائی نہ دے گی تو کیا اس شخص میں پائی جائے گی جس کا ہیرو نپولین، سیزر یا ایسا ہی کوئی اور ہو؟ بچپن سے اخیر عمر تک مرحوم کی اس صفت کے سب مداح رہے، ـــــــ چھوٹا ہو یا بڑا شناسائی ہو یا اجنبی "سلام" کرنے میں پہل ہمیشہ ادھر ہی سے ہوتی - اہل علم اور اہل تقویٰ کے آگے تو اس تواضع سے پیش آتے جیسے کوئی شاگرد اپنے

عزیز استاد کا لحاظ کرتا ہے ــــــ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی سے پہلی ملاقات کا حال خود مولانا مدظلہٗ ہی کی زبانی سنیئے :-

"اتفاق دیکھئے کہ چند ہی روز بعد مہاراجہ کشن پرشاد آنجہانی صدر اعظم دولت آصفیہ کے یہاں دعوت ہوئی (تیرہ برس قبل کا واقعہ ہے) بہت سے مہمان تھے، کھانے سے فرصت ہوئی تو ایک خوبصورت سڈول نوجوان شیروانی اور ترکی ٹوپی میں ملبوس، بے تکلفی کے ساتھ آگے بڑھا، اور ادب سے ہاتھ ملا کر گویا ہوا، میں خود اپنا تعارف کراتا ہوں میں ہوں آپ کا شاگرد بہادر یار! آنکھوں نے حیرت سے صورت دیکھی، ناآشنا پایا، تفصیل پوچھی، فرمایا آپ کی کتابوں کو پڑھکر علم پایا، اور خطبات مدراس کو رٹ کر میلاد کی محفلوں کو گرمایا، ان کی اس تواضع سے دل شرمندہ ہوا اور ان کی اس شرافت سے سننے والوں کی گردن جھک گئی"

(معارف اگست ۱۹۴۴ء)

حق پسندی اور تواضع میں بہت ہی کم فاصلہ ہے، جس کا شعار حق پسندی، حق جوئی اور حق شناسی ہو جائے، تو انکسار، احسان مندی و خاکشی خود بخود اس میں پیدا ہو جاتی ہے، اور جب یہ صفات کسی ہستی میں جلوہ فرما ہو جائیں تو اعتراف حقیقت اور اظہار حقیقت، خواہ تخلیہ میں ہو یا علانیہ، کوئی شرمندگی اور کسی بے جا ندامت کا باعث نہیں ہو سکتا، مرحوم جس کسی کا ذرا سا بھی احسان رکھتے تھے، اس کا اظہار خانگی صحبتوں اور

پلیٹ فارم پر یکساں خلوص سے فرماتے تھے ——— اس کا ثبوت مولانائے موصوف ہی سے حاصل کیجیے :-

"ان کی یہ تواضع اور خاکساری تنہائیوں ہی میں نہیں، ہزاروں کے مجمعوں میں اسی طرح ظاہر ہوتی تھی، مولانا گیلانی (مناظر احسن گیلانی مدفیوضہ) کے ساتھ انکی ممنونیت برملا ان کی زبان سے ظاہر ہوتی، مولانا شیروانی (حبیب الرحمٰن شیروانی) کی حوصلہ افزائیوں کا اعتراف علی گڑھ یونین کی پہلی تقریر میں خود میرے کانوں نے سُنا، دارالمصنفین کی کتابوں کے احسان کی کہانی اسی سال مارچ میں دارالسلام حیدر آباد کے عظیم الشان جلسہ میں سب نے سنی" (معارف ایضاً)

یہی نہیں بلکہ اگر کبھی محسوس کرتے کہ لوگ مقابلتاً کسی اور صاحب علم وفضل کو ان پر ترجیح دے رہے ہیں تو بگڑ جاتے، ڈانٹ دیتے اور اپنی فروتنی کا اظہار پوری دیانت اور فراخ دلی سے فرماتے، اس قسم کا ایک موقع علی گڈھ یونین میں پیش آیا تھا جہاں مرحوم کی تقریر کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا عبدالماجد دریا بادی کی بھی تقریر تھی ——— اس کی تفصیل خود مولانا ہی کے قلم نے لکھی ہے :-

"۲۶ر اکتوبر ۱۹۲۱ء مقام علی گڈھ یونیورسٹی کی مجلس تاریخ وتمدن اسلامی کی دعوت پر میرا اور نواب صاحب کا دونوں کا بیان ہونیوالا تھا، نواب سحر بیان کی خطابت بچے بچے سے تحسین حاصل کئے ہوئے، اہل جلسہ نے غلطی کر کے

مجھ جیسے کج مج زبان کا وقت اس بلبل ہزار داستان کے ساتھ ہی رکھ دیا۔ وسیع اور لق دق اسٹریچی ہال اوپر سے نیچے تک بھرا ہوا، سامنے جو لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا تھا، اس نے جواب دے دیا، اب بھلا میری آواز کیا پہنچتی، ایک صاحب نے کھڑے ہو کر کہدیا کہ ہمارا وقت خواہ مخواہ ضائع ہو رہا ہے، کچھ سنائی نہیں دیتا، اور ہم تو نواب صاحب کے مشتاق ہو کر آئے ہیں۔ میں تو پہلے ہی سے ہٹنے پر آمادہ تھا، ذرا صدر صاحب سے معذرت کر کے ڈائس سے اترنے لگا۔ معاً نواب کھڑے ہوئے اور گرج کر بولے "کوئی سنے یا نہ سنے کوئی بیٹھے یا چلا جائے میں خود مولانا کے بیان کو اخیر تک سنونگا، میں تو انہی کا لکچر سننے کو آیا ہوں، اور جب تک وہ اپنا لکچر ختم نہ کریں گے میں ہرگز ایک لفظ بولنا نہ شروع کرونگا۔"

مجمع میں سناٹا چھا گیا: ـــــ ہے کہیں اس دور میں شرافت کی ایسی مثال؟" ـــــ (صدق)

تواضع کی یہ مثالیں واقعی علماء اور حقیقی مشائخین ہی کی حد تک نہ تھیں، عام دوکاندار مشائخین اور نام کے علما سے بھی ایسے ہی پیش آتے اور عام مسلمانوں کے ساتھ بھی یہی روش اختیار کر رکھی تھی ـــــ یہ کوئی معمولی مقام ہے؟ کردار کا کوئی ادنیٰ پہلو ہے؟ عام قایدین اور مشائخین میں پائی جانے والی بات ہے؟ اسی وصف گرانمایہ کی نسبت عارف سعدیؒ نے فرمایا: ـــــ

"ازیں بر ملائک شرف داشتند
که خود را به از سگ نه پنداشتند"

لیکن یہ تواضع کبھی بیجا مروت کی حد تک نہ پہنچ سکی، جب کبھی حق د

باطل میں ٹکراؤ ہوتا تو چاہے کتنی ہی بڑی اور کیسی ہی مقدس ہستی کیوں نہ ہوتی اگر اسے باطل کی تائید میں پاتے تو سب سے پہلے حق کی حمایت میں خود ہی ٹوٹ جاتے، ـــــ "حق پسندی" کے باب میں لکھا جاچکا کہ کس طرح مشائخین دکن کے بھرے اجلاس میں ان کا ایک ایک عیب گنادیا، مرحوم ان میں سے ہر ایک کی قدر کرتے تھے اور اسی بنا پر انہیں دوبارہ مجلس اتحاد المسلمین میں لانے کی مرتے دم تک کوشش فرماتے رہے، لیکن جب دیکھا کہ انھوں نے ڈیڑھ اینٹ کی الگ ہی مسجد بنالی ہے تو صاف صاف سنادیا کہ "جب تک مشائخین دکن کے عمل سے مجلس کے راستہ میں مزاحمت نہ ہو، ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا لیکن اگر ان کی جماعت کا کوئی قدم مجلس اتحاد المسلمین کے خلاف اٹھا تو یاد رکھیں کہ سب سے پہلا شخص جو ان کی مخالفت کے لئے کھڑا ہوگا، وہ بہادر خاں ہوگا۔"

یہ ہے تواضع کی صحیح کیفیت، بعض کم فہم ہر بات میں ہاں میں ہاں ملانے اور حق و ناحق میں تمیز نہ کرتے ہوئے اپنے انکسار کو صحیح تواضع سمجھتے ہیں حالانکہ یہ تواضع نہیں، بزدلی ہے اور یہ بہادروں کا کام نہیں؎

تن خویشتن سغبہ دونان کنند
ز دشمن تحمل زبونان کنند

---

# سحرِ خطابت

## بے مثل خطابت

فنِ خطابت ان فنون میں سے ہے جن کا تعلق "حصول" سے زیادہ "عطا" پر اور "کسب" سے زیادہ "وہب" پر ہے۔ اس فن میں نمایاں حیثیت حاصل کرنا باوجود سعیِ بلیغ کے انتہائی مشکل اور بعض صورتوں میں محال ہے ــــــ انسان کا ایک امتیازی وصف یہ بھی ہے کہ وہ اور حیوانات کی بہ نسبت "نطق" کی دولت سے بے حد و حساب مالا مال ہے، قلب و دماغ کی گہرائیوں میں اٹھتے ہوئے خیالات اور احساسات کو نطق کے سانچے میں ڈھالنا اسی کا حق ہے، لیکن اس حیثیت سے سب مساوی نہیں، کوئی اپنے احساسات کو اس طرح پیش کر سکتا ہے کہ ان کا ایک دھندلا سا خاکہ سننے والوں کے آگے

آجاتا ہے، اور یہ درجہ تقریباً ہر انسان کو حاصل ہے۔ لیکن بعض لوگ اپنے اظہار خیال پر اتنی قدرت رکھتے ہیں کہ اپنے اندرون کو من وعن پیش کر دیتے ہیں، اور اس درجہ کا حصول کچھ زیادہ مشکل نہیں، مگر چند افراد ایسے ہوتے ہیں جو نہ صرف اپنے دل کی بات کو پوری صفائی کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں بلکہ اثر بھی منتقل کرتے ہیں اور شاید جتنے خود متاثر ہوتے ہیں اس سے زیادہ اوروں کو متاثر کر سکتے ہیں، یہی مقام سحر کاری کا ہے اور اس کے لئے حصول کے ساتھ ساتھ علیہ قدرت بھی انتہائی ضروری ہے، ایسے ہی مقررین کے بیان کے متعلق فرمایا گیا " ان من البیان لسحر"۔

فن تقریر کی باریکیاں جاننے والوں اور فلسفۂ اجتماع کی گتھی سلجھانے والوں نے "خطیب کے آلات" کی کافی وضاحت کی ہے، سب سے پہلی چیز جو ایک اعلیٰ درجہ کے خطیب (آوریٹر) میں ضروری ہے، وہ ہے اس کی سطوت ذاتی یعنی اس کا پر شکوہ اور باعظمت ڈیل ڈول، پھر اسی مناسبت سے بلند آواز، ورنہ اگر انسان ہو تو بڑا ہی وجیہہ اور آواز ہو بہت پست اور بیمار کی سی تو اس کی تقریر کا خاک بھی اثر نہ ہوگا، ان دو صفات کے ساتھ موثر لہجہ بھی انتہائی ضروری ہے، اگر لہجہ نہایت رکیک قسم کا ہو تو الٹا ہی اثر پڑے گا ——— ان تین خوبیوں کا حامل اگر نطق کے ذریعہ ساحری کرنا چاہے تو اسے تین باتوں پر قدرت حاصل ہونی چاہیئے جو مشق سے ہاتھ آتی ہے۔ اس کو اپنی ہر بات بڑے ادعا اور انتہائی تحکم کے ساتھ پیش کرنے پر قابو حاصل ہو، اسی کو اصطلاح میں تاکید کہتے ہیں، ساتھ ہی اپنا مفہوم ذہن نشین کرانے اور اپنی بات منوانے کے لئے اسے مختلف انداز میں، نئے نئے اور دلکش پیرایہ میں بیان کر سکے، اسی کو تکرار کہتے ہیں، نیز اس میں ایک اور خوبی بھی موجود ہو،

وہ یہ کہ جس بات سے ایک فرد متاثر ہو چکا ہو، اسی اثر کو عام کر سکے، تاکہ اُس ایک کی طرح سارا مجمع متاثر ہو جائے، یہی تعدیۂ اثر کہلاتا ہے ـــــــ پہلی تین خصوصیات سے جو جتنا سرفراز کیا گیا ہوگا اور بعد کی تین خوبیاں جس حد تک پیدا کر لی گئی ہوں گی، اتنا ہی وہ شخص بہترین اور موثر ترین خطیب ہوگا، لیکن یہ تو "مشین گن" کی ساخت ہوئی، محض مشین بنا لینے سے تو دشمن مغلوب نہ ہوگا اس مشین کے لئے تو "گولیاں" فراہم کرنا ضروری ہے، خطیب کے "مشین گن" کی گولیاں، اس کے معلومات کا ذخیرہ ہے جو بر وقت ترشے ترشائے انداز میں مراد فصاحت، بلاغت اور بدائع کی خوبیوں کے ساتھ ـــــــ اس مشین سے نکلنے لگے، اب جو بھی گولی نکلے گی وہ مخاطب کے قلب و دماغ کو مجروح کر کے رہے گی۔

مرحوم قائد ملت کو خدائے تعالیٰ نے سطوت ذاتی کے اعلیٰ ترین معیار کا نمونہ بنایا تھا، جسیم و شکیل تھے، متناسب الاعضاء تھے، آواز بھی ویسی ہی بلند، اور موثر کہ ہزاروں کے مجمع کو بلا لوڈ اسپیکر (آلۂ مکبر الصوت) نہایت آسانی سے مخاطب کر سکتے تھے، اس کے ساتھ لہجہ بھی ایسا دلفریب پایا تھا کہ مخالفین کے مجمع میں بولنے لگتے تو سب کی گردنیں جھک جاتیں، زبانوں کو قفل لگ جاتے، دلوں کے پٹ کھلنے لگتے اور بات اپنا قبضہ جما کر ہی رہتی۔

اِس عطا سے فائدہ اٹھانے کے لئے مرحوم نے تقریر کی کافی مشق بھی کی، اور بہت جلد ایسا قابو حاصل کر لیا کہ تاکید، تکرار اور تعدیہ اثر کے ذرایع پوری طرح زیر ہو گئے ـــــــ مرحوم کے وسیع مطالعہ اور زبان پر

تحکم ( Commomd ) نے ان تمام خوبیوں سے ملکر تقریر کا ایک ایسا معیار قایم کر دیا جس پر ہندوستان کا کوئی مقرر نہ اتر سکتا تھا۔ بعض لوگ بولنے میں تو بڑے ماہر ہیں، زبان کی ساری خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں، لہجہ بھی کافی موثر ہے لیکن "حرکات" (یعنی چشم و ابرو، ہاتھوں اور انگلیوں کے اشارے) کے حسن سے جو اثر میں بھی تاثیر پیدا کرتے ہیں، اکثر یا تو عاری ہیں یا بہت کم بہرہ ور ہیں، مرحوم اس معیار کے مقرر تھے کہ ان کو دیکھکر فن تقریر کی ایک اعلیٰ معیاری کتاب لکھی جا سکتی تھی، ان کی تقریر کی اساس بالعموم تین چیزیں ہوتی تھیں، اسلامی تاریخ کے معلومات، ابو الکلام کے الفاظ اور اقبال رح کے اشعار ـــــ مگر زبان ابو الکلام سے کیقدر سہل اور بندشیں نسبتاً آسان ہوتیں ـــــ

لیکن کیا واقعی محض یہی چیزیں تھیں جن کی بناپر چند ہی سالوں میں مرحوم کی سحر کلامی اور فصاحت بیانی کا سکہ ہندوستان کے طول و عرض میں بیٹھ گیا؟ کیا اس میدان میں کوئی اور حریف کوئی اور ابو الکلام و ابو البیان نہ تھے؟ اگر تھے اور وہ تھے جن کا سحر چل چکا تھا، جن کا طلسم چھا چکا تھا تو محمد بہادر خاں نے اس بھوت کو کیسے اتارا؟ ـــــ اصل یہ ہے کہ جتنی "صفاتِ مقرر" گنائی گئیں ان سب کا تعلق ظاہر سے ہے، اس لئے اثر بھی ظاہر ہی پر پڑتا ہے اور جس طرح "ہوالظاہر" تعو کے سوا سب ظاہر آنی و فانی ہے اسیطرح اِس بنائے ہوئے ظاہر کا اثر بھی ویسا ہی وقتی اور موقتی ہوتا ہے، بہادر خاں کی ساحری کا راز ان کا "اندرون" تھا ان کی تڑپتی ہوئی روح تھی، مچلتا ہوا دل تھا، عشق کی بھڑکتی ہوئی آگ تھی، سرد دلوں میں حرارت ایمانی پیدا کرنے کا بے پناہ جذبہ تھا ـــــ کتنے "ابو البیان" اور "ابو الکلام"

تاراسنڈل کی طرح ابھرے اور راکھ بنکر گر گئے، لیکن مرحوم تو آفتاب تھے، عشق رسول کے نورانی داغ سے قلب کو منور کر چکے تھے، جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی یہ داغ گہرا ہوتا گیا، اس کی تنویر بڑھتی گئی، اسی لئے اثرات بھی بڑھتے گئے ——

فن تقریر کے تمام داؤ پیچ ایک طرف اور "جذب اندرون" کی سادگی دوسری طرف، جس اکھاڑے میں بھی ان کی مدبھیڑ ہوگئی "جذب اندرون" ہی کے سر نصرت و کامرانی کا سہرا بندھے گا، اگر ایسا نہ ہوتا تو سیدھی سادی بلکہ لوٹی پھوٹی زبان میں "پیغام حق" لیکر اٹھنے والے یونان کے مقرروں کو مات نہ دے سکتے اور آج چار دانگ عالم میں اس کا بول بالا نہ ہوتا!

**میلاد کی محفلیں** مرحوم کی تقریروں کی ابتدا میلاد کی باسعادت محفلوں سے ہوتی ہے، آج سے تقریباً بیس سال قبل کا وہ زمانہ تھا جب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی صدر الصدور دولت آصفیہ تھے اور ان کے سبب سے میلاد کی محفلوں کی بڑی کثرت اور چہل پہل تھی، شستہ اور محتاط مقررین کی تلاش رہتی تھی، اس سلسلہ میں تازہ وارد نوجوان بہادر خاں کی حوصلہ افزائی پر حوصلہ افزائی کی گئی ——

پہلی تقریر بمقام لال دروازہ ہوئی، میلاد کا جلسہ تھا، ہزارہا مسلمان جمع تھے جب اور مقرروں نے اپنا اپنا فرض ادا کیا تو ایک نوجوان تخت خطابت پر ایستادہ ہوا اور آیۂ "ان کنتم تحبون اللہ الخ" پر وجد آفرین تقریر شروع کی، انداز بیان، ترکیب و بندش کی چستی، معانی کی فراوانی کم عمری میں پختگی اور کہنہ مشقی کے آثار دکھا رہی تھی، اس اعجاز بیانی نے سب کو اپنی طرف کھینچ لیا اور اب کوئی بڑا جلسہ بغیر بہادر خاں کی شرکت کے نہ ہوسکا ہر نقش ثانی، نقش اوّل سے بہتر ثابت ہوتا گیا۔

## خسرو دکن کی طرف سے خطاب

اسی زمانہ میں وکٹری پلے گراونڈ پر حیدرآباد کا ایک عظیم الشان جلسہ میلاد منعقد ہوا کرتا تھا، بیرون دکن کے ممتاز علماء بھی خصوصیت کے ساتھ مدعو رہتے اور اعلیٰ حضرت خسرو دکن بھی اس محفل میں شرکت کی سعادت حاصل فرماتے تھے، ایک سال ان کی موجودگی میں مرحوم نے "حیات طیبہ کی جامعیت" پر ایمان افروز اور بصیرت آفریں تقریر فرمائی، جس کے ہر ہر جملہ پر صاحبان ذوق متحیر تھے اور خود اعلیٰحضرت تاثیر میں ڈوبے چلے جا رہے تھے۔ —— اس اثر آفریں تقریر کے سلسلے میں دوسرے ہی روز "بہادر یار جنگ" کے خطاب سے سرفراز فرمایا گیا۔

## ابنائے ملت کی طرف سے خطابات

میلاد کی ان تقریروں سے متاثر ہو کر مسلمانوں نے "لسان الامت" کے نام سے پکارا، اور جب واقعی ان کی زبان نے "لسان الامت" کا درجہ حاصل کر لیا اور مجلس اتحاد المسلمین اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے ملت اسلامیہ کی صحیح ترجمانی ہونے لگی تو سب نے "قاید ملت" کے نام سے پکارا حقیقتاً یہی خطاب مرحوم کی جامع شخصیت کا آئینہ دار تھا اور اسی لئے اخیر عمر تک یہی مقبول رہا۔

چمنستان ہند اب برسوں ایسے بلبل ہزار داستان کے لئے رویا کرے جس کے دلکش اور دلفریب نالوں میں عشق حقیقی کی آگ تھی، ملت اسلامیہ کے دکھ کا صحیح سوز تھا اور اس کو مقام اصلی پر لانے کی انتہائی تڑپ تھی۔ افسوس۔

وہ ترنم ریز بلبل چپ ہوئی ایسی کہ بس
سوز بھی رخصت ہوا جاتی رہی تاثیر بھی

**خطابت کے چند نمونے** مرحوم کی اعلیٰ خطابت کے چند ثبوت بعض حقائق کے ثبوت میں گذر چکے ہیں، چند اور درج ذیل ہیں:-

(i) آل انڈیا تبلیغ کانفرنس سے خطاب ہے ——— "محمد الرسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو سنائے ہوئے حکم "فاصدع بما تومر" کی تعمیل میں آمادۂ اشاعتِ پیغام الٰہی ہو جانے والو! یہ وہ راستہ نہیں ہے جس سے آبلہ پائی کے بغیر گذر جاؤ، یہ وہ لقمہ نہیں ہے جو حلقوم کو زخمی کئے بغیر ہضم ہو جائے یہ وہ منزل نہیں ہے جو ہفت خوان کو طے کئے بغیر ہاتھ آجائے۔ یہاں ترغیب کی سنہری زنجیریں ہیں اور ترتیب کی آہنی طاقتیں، کبھی مکّہ کی ساری دولت ڈھیر کی جا رہی ہے، قریش کی ساری مہوشیں جمع ہیں اور عرب کا تخت آراستہ کیا جا رہا ہے تو کبھی بدر کا بدلہ لینے کی قسمیں کھائی جا رہی ہیں، تلواریں صیقل ہو رہی ہیں، نیزوں کے پھل گھسے جا رہے ہیں اور تیروں کے پیکان آزمائے جا رہے ہیں ——— یہاں ان آہنی قدموں کی ضرورت ہے اور اس کوہ صفت ارادہ کی جو شمس و قمر کی تسخیر کو ٹھکرا دے، جو طوفان مصائب کے سامنے گردن تانے کھڑا ہو، جو پیشانی میں زرہ کی کڑی چبھونے تیار ہو جائے، جو دانت کے ٹوٹنے پر مسکرا دے اور جو گھر بار لٹا کر شکر کرے۔ ———"

(ii) "علماء کی مجالس درس اور صوفیا کے حلقہ ہائے ذکر مبلغین کی مستقل تربیت گاہیں ہوتی تھیں، جہاں کے فراغت یافتہ گلیم توکل کاندھوں پر ڈالے اور عصائے توحید ہاتھوں میں لئے دنیا کی پہنائیوں میں پھیل جاتے اور صراطِ مستقیم سے بھٹکے ہوؤں کو پیغام ربانی سناتے تھے،

انہی گلیم پوشان تخت نوازیں سے ایک سنجر کی آبادیوں سے چلتا ہے، چشت کے میدانوں سے گزرتا ہے، خیبر کی وادیوں کو طئے کرتا ہے اور سرزمین ہند کے قلب میں جم جاتا ہے۔ رحمتہ اللہ علیہ وعلیٰ اتباعہ "

(iii) دارالسلام (حیدرآباد) کے پچاس ہزار کے جلسہ کو مخاطب کر کے فرمایا۔ (۱۳۵۹ھ کے سالانہ اجلاس اتحاد المسلمین میں)

"اب بتاؤ کہ تم خود کیا کرنا چاہتے ہو؟" (جواب ملا کہ ہم آپ کے لئے جان دینے تیار رہیں) اس پر فرمانے لگے ——— "میرے لئے جان دیکر اپنی موت کو مردار نہ کرو، جو غیر اللہ کے لئے جان دیتا ہے وہ مردار موت مرتا ہے، اور تمہاری جان کی اس وقت کوئی ضرورت نہیں ——— میرے آشیانہ پر بجلی چمک رہی ہے، اس کو جل جانے دو، تمہارے لئے یہ مبارک فال ہے۔ یہی ابر تمہارے گلشن حیات پر برسینگے اور بہت جلد اس میں بہار آئے گی۔ میں اپنے اُجڑے ہوئے آشیانے کی خاکستر پر بیٹھا اس بہار کا لطف اُٹھاؤں گا ——— ہوائیں چل رہی ہیں۔ اَبر چھٹیں گے، آفتاب امید چمکیگا اور دنیا دیکھیگی کہ حق ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے، اور باطل کے پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کی طرح اڑتے ہوئے نظر آئیں گے ———

(حکومت کی طرف سے ترہیب کے جال بچھائے جا رہے تھے)

(iv) ۱۳۵۸ھ کی صدارتی تقریر جلسہ سالانہ مجلس اتحاد المسلمین دارالسلام میں آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کے قیام پر اعتراض کا جواب دے رہے ہیں:-

"میں خود اس کا قائل رہا ہوں کہ حیدرآباد ایک مستقل سلطنت ہے، اس کی تاریخ اور اس کے روایات اس کے لئے ایک بالکل جداگانہ ماحول

پیدا کرتے ہیں، اور کسی کو حق نہیں کہ اس کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرے لیکن گزشتہ دو سال میں اندازہ ہوا کہ اپنی انتہائی خوبی کے باوجود یہ نظریہ ہمارے لئے ایک دھوکا ثابت ہو رہا ہے ــــ ہندوستان کے وسیع سمندر میں موجیں اٹھ رہی ہیں، طوفان آرہے ہیں، سطح مرتفع دکن کی خاک کے ذرے ان طوفانوں کو خود آگے بڑھکر دعوت دے رہے ہیں اور کشتیٔ دکن کے نام نہاد ناخدا ان طوفانوں کو اٹھتا دیکھکر لرزہ براندام حیات سے مایوس اور دام موج کے پہنچنے سے پہلے کشتیٔ حیات کو غرق کر دینے پر مائل نظر آتے ہیں۔ مسافروں کو تھوڑی دور پر چٹان نظر آرہی ہے اور وہ اس پر چڑھ سکتے ہیں، لیکن بیرونی طوفان کو دعوت نامہ لکھنے والا ہاتھ ان کو روکتا ہے کہ خبردار غیر کی اعانت حاصل نہ کرنا ــــ میں کہہ چکا ہوں کہ حیدرآباد کی انفرادیت اور استقلال کی بقا ضروری ہے میں آج بھی اس کو اپنے مقاصدِ حیات میں سے ایک سمجھتا ہوں اور کوئی ہرج نہیں سمجھتا کہ اپنی اس انفرادیت اور استقلال کو مضبوطی سے قایم رکھتے ہوئے وہ دوسروں کی طرف تعاون و اشتراک کا ہاتھ بڑھائے۔"

(۳) مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کراچی (جنوری ۱۹۴۴ء) کے آخری جلسہ کی تقریر تو پوری کی پوری فن تقریر کا شاہکار رہے (مع اپنی معنوی بلاغتوں کے) لیکن صرف ایک فقرہ درج ذیل ہے ــــ

مرحوم نے جب دوران تقریر فرمایا کہ میں جس دن اپنی جان و مال نچھاور کر دوں گا وہی دن میری انتہائی مسرت کا دن ہوگا، تو مجمع بھی ہم نوا ہو گیا۔ اس موقع پر فرمایا:۔

"اس قدر جلد فیصلہ نہ کیجئے۔ میں نے اپنے جس عزم کا اظہار آج کیا ہے

وہ میری بارہ یوم کی شبانہ روز فکر و تعمق کا نتیجہ ہے، میں نے اس کی تیاری کی اور اس پر عمل بھی شروع کر دیا —— جاؤ اپنی بیویوں کے تابناک چہروں کو، اپنے بچوں کی مسکراہٹ کو آنکھوں کے سامنے رکھکر فیصلہ کرو۔ اپنی تجارت و ذرایع معاش کی ساری تباہیوں کا تصور کرکے ایک مرتبہ تصفیہ کرو۔ بسلمانو! وہ تصفیے جو جوش کے عالم میں، دیونسروں کی تقلید میں کر دیئے جاتے ہیں بسا اوقات آنی اور اسی لئے فانی ہوتے ہیں۔ آج ہمیں ان کی ضرورت نہیں جو شجر ملت پر پھول بن کر جھکنا چاہتے ہوں اور پھل بن کر کام و دہن کو شیریں کرنا چاہتے ہوں۔ ہمیں ان کی ضرورت ہے جو کھادیں جو زمین میں جذب ہوتی ہے اور جڑوں کو مضبوط کرتی ہے، جو مٹی اور پانی سے ملکر رنگین پھول پیدا کرتی ہے، جو خود فنا ہوتی ہے اور پھلوں میں لذت و شیرینی پیدا کرتی ہے —— ہم کو ان کی ضرورت نہیں جو کاخ و ایوان کے نقش و نگار بن کر نظارہ باز کو خیرہ کرنا چاہتے ہوں، ہم ان بنیاد کے پتھروں کو چاہتے ہیں جو ہمیشہ کے لئے زمین میں دفن ہو کر اور مٹی کے نیچے دب کر اپنے اوپر عمارت کی مضبوطی کی ضمانت قبول کرتے ہوں۔ میں نے کل کہا تھا اور آج پھر سنا دینا چاہتا ہوں۔

ایسی کوئی دنیا بھی ہے افلاک کے نیچے
بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تخت جم و کئے

کس تقریر کے کون کون سے حصہ کو نقل کیا جائے؟ انتخاب آسان نہیں بہت مشکل ہے! جس مقام کو دیکھو۔ ع

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

تفصیل کے لئے اخباروں کے صفحات، "سیاسی تقاریر قائد ملت" والی کتاب موجود ہے مگر افسوس کہ ان تقاریر میں اصل کا رنگ بہت ہی کم ہے!

غرض ہزاروں بلکہ لاکھوں کے مجمع میں کھڑے ہوئے جب "لسان الامت" ساحرانہ تقریر کرنے لگتے تو بلا مبالغہ سانسوں کی آواز سنائی دیتی، فسوں کاری کا یہ عالم ہوتا کہ بوڑھے بچے، بیمار، تندرست، عالم وجاہل سب ہمہ تن گوش ہو جاتے اور حقیقتاً کسی کو اپنی سدھ ہی نہ رہتی تھی، —— ہزاروں کے مجمع کو ہنسانا، رلانا "لسان الامت" کے لئے ایک بہت معمولی بات تھی، چنانچہ جب کسی سنجیدہ گفتگو کی وجہ سے مجمع پر بڑی دیر تک سکتہ رہتا تو خود ہی بعض لطائف سنا کر ہنسا دیتے تھے اور پھر کچھ دیر بعد اپنی اصل گفتگو کی طرف لوٹ آتے، خود فرماتے تھے کہ اگر ایسا نہ کروں تو لوگوں کے دماغ پر بُرا اثر پڑے گا، اسی طرح جب رُلانے پر تل جاتے تو ہزاروں کا مجمع دھاڑیں مار مار کر رونے لگتا تھا، مجلس اتحاد المسلمین کے کثیر اجتماعات کو بارہا رلایا ہے، ابھی کراچی میں لیگ کے ایک لاکھ اجتماع کو بیخود کر دیا تھا، اور ان کی نہ صرف آنکھوں کو بلکہ دلوں کو رلا دیا تھا۔

مرحوم کی ان جادو بیانیوں کا اثر کیا ہوتا تھا؛ مولانا جمال میاں فرنگی محل نے مجلس اتحاد المسلمین کے ایک سالانہ جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے نواب مرحوم کی بڑی پیاری اور صحیح تعریف فرمائی تھی، فرمایا کہ "اس سے بڑھکر نواب صاحب کی اور کیا تعریف کی جائے کہ جب تقریر ہو چکتی ہے تو ہزاروں بے نمازی نمازی ہو جاتے ہیں ہزاروں راہ گم کردہ، راہ راست پر آجاتے ہیں، ہزاروں بے عمل، عمل کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں، اس کا مشاہدہ خود میری آنکھوں نے بارہا کیا ہے،" "وعظ گوئی" پر نواب صاحب کا بڑا احسان ہے کہ ان کی تقاریر کی وجہ سے جو در اصل وعظ ہی ہوتی ہیں، وعظ کا گرا ہوا معیار پھر انتہائی بلند ہو گیا، یا تو یہ عالم تھا کہ انگریزی پڑھے لکھے مذہبی باتیں سننا گوارا ہی نہ کرتے تھے یا اب یہ ہے کہ نواب صاحب کی تقاریر کی وجہ سے ہر ایک ان کو بڑی دلچسپی اور تندہی سے

سنتا ہے اور ان کی ٹوٹی پھوٹی تقلید کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتا ہے"۔ مولانا فرنگی محلی کی اس تعریف کا ایک ایک لفظ صداقت و حقیقت میں ڈوبا ہوا ہے یہ کس کی تقاریر کا اثر تھا کہ حیدرآباد کے اعلیٰ عہدہ دارانِ سلطنت اور جامعہ عثمانیہ کے عام پروفیسر بھی جب مخاطب کرتے تو ایک آدھ مذہبی بات کہتے ہوئے انتہائی فخر محسوس کرتے تھے؟ یہ کس کی تقاریر کی کلیمی تھی کہ باطل کا سحر ٹوٹ کر رہ گیا اور مذہب کی طرف رغبت بڑھتی ہی گئی؟ کتنے ڈاڑھی منڈے فیشن ایبل تھے جو مرحوم کی تقریریں سن سن کر متشرع ہو گئے! مرحوم کی تقاریر سے پہلے تو یہ کیفیت نہ تھی!

کیا یہ سب کچھ محض ظاہر کا اثر تھا؟ کیا ظاہر سے زیادہ باطن کی کارفرمائی نہ تھی؟ مثل مشہور ہے کہ "ہرچہ از دل خیزد بر دل ریزد" اگر مرحوم کی تقریر محض فن خطابت کا شاہکار ہوتی تو اس سے لوگوں کی حالتیں کیوں بدل جاتی تھیں؟ اثر وقتی نہیں بلکہ مستقل اور دائمی کیوں ہوتا تھا؟

---

# خدماتِ علمیّہ
# و
# طرزِ اصلاح

**تاریخ اسلام پر نظر** "تاریخ اسلام" اور "مسلمانوں کی تاریخ" مرحوم کا خاص موضوع تھا، اس فن کا انھوں نے غائر مطالعہ فرمایا تھا، عمیق فکر کی تھی اور خوب سمجھتے اور سمجھاتے تھے، دارالمصنفین ندوۃ العلماء کی کتابوں کے علاوہ اور دوسری تمام مستند کتابیں مطالعہ میں آچکی تھیں اور ذہن میں اچھی طرح محفوظ تھیں، عام لوگوں کی طرح صرف واقعات پر نظر نہ تھی بلکہ ان کے اسباب و علل پر خاص توجہ رہتی، قوموں کے اتار چڑھاؤ اور ان کی نفسیات کا بہت باریک بینی سے پتہ چلاتے تھے،

خاکسار تحریک میں شرکت کے زمانہ میں بعض نوجوانوں کے اصرار پر

"تاریخ اسلام" کا درس بھی دیا کرتے تھے، ہفتہ میں ایک بار "بیت الامت" میں شوقین حضرات جمع ہوتے اور مرحوم پوری مورخانہ شان سے تاریخ سنایا کرتے تھے؛ "ان الدین عند اللہ الاسلام" کی رو سے مرحوم نے "تخلیق آدم" سے تاریخ اسلام کی ابتداء فرمائی، تمام ماورائے ارضی حقایق کو پیش فرمایا اور پھر آدم علیہ السلام کے اس جہان میں آنے کی تاریخ شروع ہوئی۔ استدلال میں آیات قرآنی سے کام لیتے تھے، لیکن حضرت آدمؑ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور تک نہ تو کوئی مسلسل تاریخ ملتی ہے اور نہ کلام پاک اس کی تفصیلی رہبری فرماتا ہے، اس طویل دور میں (آدم تا بعثت خاتم المرسلینؐ) بعض تاریک ادوار آتے ہیں؛ ایک مورخ کا کام یہی تو ہوتا ہے کہ ایسے دور کے متعلق اس کے گذشتہ اور آئندہ حالات کو پیش نظر رکھکر قیاس قایم کرے، جس کی نظر جتنی عمیق ہوگی قیاسات بھی ویسے ہی اعلیٰ اور حقیقت سے قریب تر ہوں گے، مرحوم اس حیثیت سے ایک بہترین مورخ تھے اور قیاس آرائی میں کمال رکھتے تھے ـــــ تاریخ سناتے ہوئے قوموں کے اتار چڑھاؤ کے اسباب کی خاص طور پر توضیح فرماتے اور موجودہ حالات سے اس کا مقابلہ کرکے حقیقت حاضرہ کو بے نقاب فرماتے تھے ـــــ مثلاً بنی اسرائیل کے واقعہ ہجرت پر پہنچے تو فرمایا کہ جب اللہ نے موسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجی تو انھوں نے اپنی قوم کو سنا دیا کہ ہجرت کرنا ہے ـــــ بنی اسرائیل یوسف علیہ السلام کے زمانے سے مصر میں آباد تھے موسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی تھی؛ موسیٰ علیہ السلام اتنی کثیر تعداد کو لے کر راتوں رات کیسے نکل سکے ہوں گے؟ حمل ونقل کی دشواریاں، غربت اور کثرت! ایسی حالت میں اتنی تعداد کا شہر سے

نکل جانا اور پھر کسی کو خبر نہ ہونا کس قدر تعجب کی بات ہے! حالانکہ فرعون کی فوج اور اس کی سی، آئی، ڈی، ان کی تاک میں تھی اور بعض روایات کے بموجب وہ بنی اسرائیل کے عید کا دن تھا، ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے صبح تک کسی کو خبر ہی نہیں ہوئی اور پتہ لگتا ہے تو اس وقت جبکہ وہ بحر احمر کے کنارے پہنچ چکے ہوتے ہیں! کیا کوئی جادو تھا یا معجزہ؟ —— دیکھا گیا ہے کہ جس قوم پر صدیوں سے غلامی مستولی ہوتی ہے اس پر اتنا خوف طاری رہتا ہے وہ کوئی بات علی الاعلان نہیں کر سکتے، کانا پھوسی Conspiracy یا جسے عربی میں "نجوئی" کہتے ہیں، کی صفت پیدا ہو جاتی ہے، اور یہ قوم کی انتہائی پستی کی علامت ہے —— موجودہ مسلمان ابھی اس حد سے دور ہیں "پدرم سلطان بود" کہہ کر اب بھی ہر کام شور و غوغہ سے کرتے ہیں، لیکن کام کم ہے آواز زیادہ ——

اسیطرح قارون کے خزانہ کا ذکر اور اس کے زمین میں دھنس جانے کا واقعہ آیا تو توضیح فرمائی کہ دولت یا تو خدا کی

(i) عطا ہوتی ہے۔

(ii) سزا ہوتی ہے۔

(iii) یا بلا (امتحان) ہوتی ہے —— غرض جو بھی واقعہ بیان کیا جاتا اس سے حال کو سنوارنے کے سامان ضرور فراہم کئے جاتے ——

درس تاریخ کا یہ سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا، تخلیق آدم سے حضرت عمرؓ کے دور تک تاریخ بیان کی جا چکی تھی کہ مجلس اتحاد المسلمین کی گوناگوں مصروفیتیں اس میں حائل ہوئیں اور سلسلہ ٹوٹ گیا، بعد میں

لوگوں کے اصرار سے مرحوم نے پھر اس کے احیاء کی کوشش کی مگر فرصت نے ہمیشہ مخالفت کی۔

مرحوم کی "تاریخ اسلام" پر وقت نظری کے سب قائل تھے، چنانچہ کل ہند تاریخ اسلام کانفرنس کے جلسوں میں کئی تقریریں ہوئیں، اور اس کا ایک اجلاس حیدرآباد میں مرحوم کی صدارت ہی میں ہونیوالا تھا، لیکن بعض وجوہ کی بنا پر ملتوی ہوگیا۔



# قرآن سے عشق

مرحوم کو قرآن سے انس نہیں عشق تھا اور اس کا ثبوت اپنے عمل سے عمر کے آخری لمحوں تک پیش کرتے رہے۔ بچپن میں خدا ترس نانی کی قرآن نہ پڑھنے پر خفگی (کہ "تم نے آج اللہ سے باتیں نہ کیں، میں تم سے بات نہ کروں گی") نے یہ حقیقت ذہن نشین کرا دی تھی کہ قرآن (نعوذ باللہ) کوئی منتر جنتر نہیں جسے رٹ کر مقصود حاصل کیا جا سکتا ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں جنھیں خوب سمجھنے کی ضرورت ہے کیونکہ بغیر سمجھے عمل کی اصلاح نہیں ہو سکتی اور جب تک عمل درست نہ ہو اللہ تعالیٰ کیسے راضی ہو جائیں گے؟

سعادت مند نواسے نے اپنی نانی کی نصیحت پر عمل شروع کیا، قرآن کو سمجھنے کی کوشش شروع کر دی، علما سے استفسارات کئے، تفاسیر کا مطالعہ شروع ہوا، یہ سب کچھ ہو رہا تھا کہ ایسے میں ایک راز دانِ حقیقت نے آواز دی کہ "لڑکے!":-

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف (اقبال)

آنکھیں کھل گئیں، حقیقت و انکشاف ہوگئی۔ اب ایک ایک آیت کو خود پر طاری کرنے کی کوشش کی گئی اور بالآخر یہی حال بن گیا جس کی مثالیں بہت سوں نے دیکھیں

ایک دفعہ ایک مسجد میں نماز کے لئے آئے، کسی قاری صاحب نے قرارت سنانے کی خواہش ظاہر کی۔ مرحوم کے لئے اس سے زیادہ دلچسپ اور کیا چیز ہو سکتی تھی، فوراً سننے آمادہ ہو گئے، قاری نے " والضحیٰ " کی سورت تلاوت کرنی شروع کی، تھوڑی ہی دیر میں ہمہ تن گوش قاید کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں اور ایک خاص کیفیت طاری ہوگئی، سورۃ ختم ہوئی تو سسکیاں لیتے ہوئے فرمایا " پھر پڑھیئے " دوبارہ پڑھی گئی، ارشاد ہوا " پھر سنائیے مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ یہ آیتیں مجھ ہی پر نازل ہو رہی ہیں اور گویا میری ہی زندگی کا نقشہ اس میں کھینچا گیا ہے " —— قاری صاحب نے کوئی آٹھ دس بار وہی سورۃ سنائی تب کہیں جاکر دل کو کسقدر قرار آیا اور سیلاب اشک تھمنے لگا۔

تفسیر بیان کرتے ہوئے اس کیفیت کا مشاہدہ تو بارہا ہماری آنکھوں نے کیا، کتنی دفعہ یہ ہوا کہ قرآن مجید کھلا، ابھی صرف ایک نظر ہی آیتوں پر پڑی تھی کہ دل کی کیفیتیں آنکھوں کی زبانی ظاہر ہونے لگیں، دیکھتے ہی دیکھتے سسکیاں بندھ گئیں اور جب کافی وقت گزرنے پر بھی قابو نہ حاصل کیا جا سکا تو اسی حالت میں گھر کی راہ لی —— قرآن سے شغف کی ایسی مثالیں نادر ہی ہیں!

قاری روشن علی صاحب نہ صرف حیدرآباد کے ممتاز قاری ہیں بلکہ ان کی شہرت عرب تک پہنچ چکی ہے، اپنے فن کے یکتا و یگانہ ہیں۔ مرحوم نے "فن تجوید" اُن ہی سے حاصل کیا تھا اور خوب واقف تھے، یہی وجہ ہے کہ اکثر قاری مرحوم سے داد حاصل کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے تھے ـــــ اس فن سے مرحوم کی دلچسپی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہر سال ماہ صیام میں ایک رات "بیت الامت" میں محفل قرءت ہوتی، جس میں ملک کے بڑے بڑے اہل فن جمع ہوتے اور اپنے کمال کا مظاہرہ کرتے تھے۔

مرحوم فرماتے تھے اور بجا فرماتے تھے کہ ان کا مقصد مسلمانوں کو قرآن سے آشنا کرانا ہے، ایک مرتبہ درس تفسیر ختم ہونے کے بعد حسب عادت دعائے ماثورہ (اللھم ارحمنا بالقرآن العظیم الخ پڑھی، نہ معلوم کیا خیال آیا کہ گریہ طاری ہو گیا فرمانے لگے:۔

"خانۂ خدا میں بیٹھے، کتاب اللہ کو ہاتھ میں لیے قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری تقریریں، جلسہ آرائیوں اور ہمہ ہمی کا مقصد سوائے اِس کے کچھ نہیں کہ لوگ قرآن کو سمجھنے لگیں اور اس پر عمل پیرا ہو جائیں، اگر مسلمانوں نے اس کو (قرآن) چھوڑ دیا تو وہ کہیں کے نہ رہیں گے، یہی ان کی پناہ گاہ ہے!"

اس کی عملی صورت یہ پیش کی کہ مجلس اتحاد المسلمین کے ہر عہدہ دار اور عام مسلمان پر یہ فرض گردانا کہ روزانہ کم از کم تین آیتیں ترجمہ کے ساتھ تلاوت کرے، اپنی شاخوں کو ہدایت دی کہ ہر جگہ مسجد میں قرآن کو ترجمہ سے سنانے یا تفسیر بیان کرنے کا اِنتظام ہونا چاہیئے اور اپنے دوروں میں

تنقیح کے وقت سب سے پہلے یہی دیکھتے تھے کہ قرآن مجید کی خدمت ہو رہی ہے یا نہیں؟

**درسِ تفسیر** خود مرحوم نے اپنی مسجد میں روزانہ بعد نماز فجر ایک گھنٹہ تفسیر سنانے کا اہتمام کر رکھا تھا، سوائے ان دنوں کے جن میں مرحوم حیدرآباد سے باہر ہوتے، روزآنہ یہ سلسلہ جاری تھا، فرماتے تھے کہ "مجھے اگر کسی عمل کے صلے میں بخشش کی توقع ہے تو وہی قرآن کی خدمت ہے"۔

چبھتے ہوئے جاڑوں میں پریشان کن گرمیوں میں اور موسلا دھار بارش میں یہ عیش کا پروردہ، دولت کا آفریدہ نواب محض اللہ کے لئے ایک چھوٹی مسجد میں چٹائی پر بیٹھے، اپنے آقا کے کلام کو سمجھایا کرتا تھا۔ ساتھیوں نے اور ایک آدھ بڑی طاقت نے یہ باور کرایا کہ یہ تمہارا مقام نہیں کہ اس طرح تفسیر بیان کیا کرو، "خود بھی فرماتے تھے کہ" یہ میرا مقام نہیں" لیکن دونوں کے کہنے میں فرق، مشرق و مغرب کا تھا ـــــ وہ منع کرتے تھے اس لئے کہ چٹائی پر بیٹھنا، عوام سے اس طرح ملنا، جاگیرداریت کے خلاف ہے، اور یہ فرماتے تھے اس نقطۂ نظر سے کہ مفسر کا مقام بہت بلند ہوتا ہے، اسی وجہ سے بارہا فرمایا کہ "میں تفسیر بیان نہیں کرتا بلکہ تفسیر سناتا ہوں، میں تفاسیر دیکھنے کا عادی ہوں اور یاد رکھنے کے لئے روزانہ صبح پڑھی ہوئی چیزوں پر غور کر لیا کرتا ہوں، خیال ہوا کہ اگر یہی کام مسجد میں ہو اور بجائے خاموش سوچنے کے باوآز بلند کہتا جاؤں تو دوسروں کا بھی فایدہ ہوگا، بس اسی وجہ سے یہاں بیٹھ کر کہنا شروع کر دیا ہے"۔

اِن الفاظ میں نہ اِنکسار تھا نہ تصنع، اگر ایسا ہوتا تو پھر پندرہ بیس برس آدمی کو

ایک گھنٹہ تک تفسیر نہ سنائی جاتی انہیں اس کا خیال ہی نہ تھا کہ کتنے لوگ آرہے ہیں، بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ صرف راقم سوانح اور موذن دو ہی سامعین رہے لیکن مرحوم برابر تفسیر سناتے رہے اور اسی طرح مطالب بیان کرتے رہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی، جس کی تقریروں کے لئے ہزاروں کی تعداد میں لوگ دوڑے دوڑے چلے آتے ہوں اس کا دو ایک افراد کے آگے اس مستقل مزاجی سے قرآن سناتے رہنا نفسیاتی اعتبار سے بڑا مشکل کام ہے۔ مرحوم کو شکایت ضرور تھی کہ "وہ لوگ جو میری تقریروں کو ایسی دلبستگی سے سننے کے عادی ہیں، تفسیر میں کیوں شرکت نہیں کرتے، حالانکہ میری یہ گفتگو ہر تقریر سے اچھی اور مفید ہوتی ہے" ـــــــ لیکن ایسا نہ ہو سکتا تھا، بالعموم لوگوں کو صبح اپنے کاموں سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ ایک گھنٹہ تفسیر کے لئے نکال سکیں، البتہ رمضان کے مہینے میں مسجد کھچا کھچ بھر جاتی تھی، اور اس قرآن کے مہینے میں سنانے والے کا رنگ بھی خاص رہتا تھا، ویسے مطالب و معانی کی فراوانی کب نہ ہوتی تھی، انداز بیان کب دلکش و دلنشین نہ ہوتا تھا، لیکن اس مہینے میں اثر دوبالا ہو جاتا تھا۔

**طرزِ تفسیر** اور تقریروں کے لئے تو شاید ہی کبھی تیار کی جاتی تھی لیکن تفسیر بڑے اہتمام سے سناتے تھے، رات میں سونے سے قبل ایک گھنٹہ یا صبح نماز فجر سے پہلے جس آیت کی تفسیر بیان کرنی ہوتی اس سے متعلق مختلف قدیم و جدید تفاسیر دیکھ ڈالتے تھے ـــــــ اور تفاسیر کا ذخیرہ تو بہت کافی تھا، قدیم تفاسیر سے لے کر جوہر طنطاوی جیسے حالیہ مفسرین کی کتابیں بھی موجود تھیں ـــــــ ساتھ ہی مختلف ترجمے پیش نظر

رکھتے تھے ـــــ اسی تیاری اور اہتمام کا نتیجہ تھا کہ درس میں بڑے بڑے کلامی مسائل حل ہوتے، فلسفہ کی گتھیاں سلجھائی جاتیں، فقہ کے نکات بیان کئے جاتے اور عارفانہ باتیں سنائی جاتی تھیں ـــــ وہ جیسے نام نہاد علماء، عالم کہتے ہوئے عار محسوس کرتے تھے ایسی جامع و مانع تفسیر سنایا کرتا، جوان جیسے بچاسوں کے لئے بصیرت کا باعث تھی، کاش شریک ہو کر استفادہ کرتے، لیکن نفس پرستی کی بیڑیاں تھیں، سند کی فصیل حائل تھی، اُن کو توڑنا کوئی آسان بات تو نہ تھی! ـــــ

بہرکیف صبح نماز فجر کے لئے مرحوم پوری سادگی کے ساتھ کرتا اور کشمیری دوپلی ٹوپی پہنے، شیخ الہند کے ترجمہ والی حمائل بغل میں دبائے مسجد پہنچ جاتے تھے، نماز خود ہی پڑھاتے، پھر کچھ دیر مراقبہ فرمانے کے بعد کلام پاک کھولا جاتا۔

تلاوت آیت کے بعد اس کا ترجمہ مختلف انداز میں سناتے، حتیٰ کے انگریزی ترجمہ بھی بتا دیتے، سامعین کو ہدایت تھی کہ ہر ایک کوئی نہ کوئی مستند ترجمہ والا قرآن اپنے ساتھ رکھے، جب خود ترجمہ کر چکتے تو پوچھتے کہ کوئی ترجمہ چھوٹ تو نہیں گیا؟ پھر فرماتے کہ میرے نزدیک یہ ترجمہ زیادہ قابل ترجیح ہے، آپ جسے چاہے اختیار کریں، اس کے بعد قواعد کے موٹے موٹے اصول بتا دیئے جاتے، لغات کی تشریح ہوتی، اور پھر مطالب و مسائل کا تذکرہ ہوتا ـــــ اس طرح روزانہ بالعموم ایک ہی آیت کی تفسیر ہو سکتی تھی، اور بعض دفعہ تو ایک ایک آیت کی تفسیر چار، چار، پانچ پانچ روز تک بیان ہوتی رہتی تھی، مثلاً جب یہ آیت شریف آئی " ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ الخ

تو صرف "اظہار دین" یعنی دین اسلام کے دیگر ادیان پر غلبہ کی تفسیر پانچ روز تک ہوتی رہی، اور عجیب معلومات افروز اور بصیرت افزا بیان ہوتا رہا ——— ایک روز "تعلیمات" اسلام کے غلبہ کا ذکر ہوا، دوسرے روز "عبادات" کا، تیسرے دن "فرائض و معاملات" کا، چوتھی نشست میں "اخلاقیات" کے نقطۂ نظر کا، اور پھر آخری مرتبہ ظاہری غلبہ کی وضاحت کی گئی اور یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے کہ ہمیں قرآن ختم کرنا ہے ورنہ ابھی فلسفیانہ پہلو رہ گیا اور دوسرے نقاط نظر سے تشریح نہ ہو سکی، فرماتے تھے بڑی مشکل ہوتی ہے قرآن کے حرف حرف کا یہ عالم ہے کہ ع

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

اسی طرح جب یہ آیۃ شریفہ آئی، کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بیعت رضوان کے سلسلہ میں لوگ تمہارے ہاتھ پر بیعت نہیں کر رہے تھے بلکہ اللہ ہی کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر تھا (ید اللہ فوق ایدیھم) تو ایک نشست میں تو صرف واقعہ بیعت سنایا گیا اور دوسرے دن اس کی ایسی بلند اور عارفانہ توضیح کی گئی کہ عام لوگوں کے لئے اس کا سمجھنا بھی دشوار تھا، (چونکہ پندرہ بیس آنیوالوں میں اکثریت پڑھے لکھوں کی بلکہ اس علم سے لگاؤ رکھنے والوں کی تھی اس لئے یہ مسائل بیان کئے جاتے تھے) اس آیت کریمہ کی وضاحت عارف رومی کے ان اشعار سے کی گئی

"من ز تن عریاں شدم او از خیال
می خرامم در نہایت الوصال
صورت از بے صورتی آمد برون
باز شد انا الیہ راجعون"

غرض اسی ڈھنگ اور اسی رفتار سے تفسیر بیان ہوتی تھی، اور اسی لئے چھ برس میں پورے کلام پاک کی تفسیر بیان کی جا سکی۔ ایک اور خاص بات یہ تھی کہ جب کوئی سورۃ ختم ہو جاتی تو اس کا مختصر خلاصہ پیش کیا جاتا تاکہ ایک اجمالی مفہوم ذہن میں محفوظ رہے، اس طریقہ سے بڑا فائدہ حاصل رہا ـــــــ مثلاً سورۂ فتح کی سمری بیان فرمائی تھی:۔

"(۱) اللہ اور رسولؐ کی اتباع نے بتایا کہ ایک پر بھروسہ کرنا چاہیئے اور اس کا اس وقت تک ساتھ دینا چاہیئے جب تک کہ اس کی پوری پوری بے ایمانی ظاہر نہ ہو جائے۔"

(۲) موجودہ کے نفع و نقصان سے آئندہ کے نقصان و فایدہ کا اندازہ پورے تدبر کے ساتھ کیا جائے۔

(۳) وقت پر حمایت سے پیچھے ہٹنے والے اور نفع کے وقت آگے بڑھنے والے اللہ کے نزدیک بہت زیادہ قابل مذمت ہوتے ہیں۔

(۴) جو لوگ خود کو جماعت کا جزو بہتر ثابت کرتے ہیں وہ بہت مبارک اور خدا کے رحم کے قابل ہوتے ہیں۔"

یہ تھا تفسیر کا انداز بیان، ذرا تفصیل سے اس لئے بیان کیا گیا کہ عام مفسرین بھی لوگوں کو درس دیتے وقت ان باتوں کا خیال رکھیں اور اس کی افادیت کا خود اندازہ لگالیں ـــــــ غرض یہ تھا قائد ملت کی صبح کا روزانہ شغل، آنکھیں برسوں رویا کریں گی اب ایسے قائد کے لئے جو واقعی معنی میں اس طرح مسلمانوں کی قیادت کر سکے۔

مرحوم کو اپنے اس شغل سے اتنی دلچسپی تھی کہ اس زمانے میں بھی جبکہ گلہ جواب دے چکا تھا، آواز مشکل ہی سے نکلتی تھی اور نزلہ بری طرح ستا رہا تھا

اِس میں ہر نوع واقع نہ ہونے دیا، لوگوں کو اپنے سے بہت قریب کر لیتے اور انتہائی پست آواز میں چشم و ابرو کو وضاحت کا آلہ بناتے ہوئے برابر ایک گھنٹہ درس دیا کرتے تھے، اور یہ کہہ رکھا تھا کہ آپ لوگوں (شریک درس ہونے والوں) کو حق حاصل ہے کہ اگر میں کبھی تساہل برتوں تو مجھے گھر سے کھینچ نکالیں۔

مرحوم کے عشقِ قرآن کا یہ عالم تھا کہ جس روز ایک پارہ ختم ہو جاتا تو بڑی ہی احسان مندی سے اللہ کی جناب میں شکر ادا کرتے کہ اس نے اپنے ایک حقیر بندہ سے اپنی تفسیر سنانے کا کام لیا، پھر اپنی طرف سے تمام سامعین کی مٹھائی سے تواضع فرماتے ۔۔۔۔ جب چھ سال کی طویل مدت کے بعد قرآن مجید ختم ہو سکا تو مسرت اور انبساط کا عالم کچھ نہ پوچھئے کیا تھا! آنکھوں سے آنسو نکلے پڑتے تھے، خوشی سے بار بار اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے جاتے تھے، اسی مسرت میں اس روز تمام سامعین

**اِنتہائی خوشی کے دو دن۔**

کو کھانے پر بھی مدعو کر لیا اور پر تکلف دعوت دی، باوجود نوکروں کی موجودگی کے خود ہی سربراہی میں مصروف تھے ۔۔۔۔ عشق کی بھی عجیب کارفرمائیاں ہوتی ہیں! اس موقع پر بعض لوگوں نے پھولوں کے ہار پہنائے تو مرحوم فرمانے لگے:۔

"پہنائیے صاحب! میں آج ضرور پہنوں گا ۔۔۔۔
میری زندگی میں اِنتہائی مسرت کے دو ہی دن رہے ہیں
ایک وہ جب کہ طواف بیت اللہ سے مشرف کیا گیا تھا،
اور ایک آج جب کہ اس کے فضل و کرم سے چھ سال

تک تفسیر بیان کرتے ہوئے قرآن پاک ختم کر سکا ہوں۔"

خوشی اس وقت نہیں ہوئی جبکہ جاگیر ہاتھ آئی، خطاب سے سرفراز کیا گیا، ملت نے اپنی قیادت سے مفتخر کیا، اللہ کے بندہ کا دل مسرت سے اسی وقت معمور ہو سکا جبکہ اس کے گھر کے نظارہ میں مصروف تھا اور جبکہ اس کی باتیں پوری پوری سنا چکا تھا ——— مرحوم کے اسی اندرونی جذبہ کا نتیجہ تھا جو بارہا تفسیر بیان کرتے وقت ہم نے محسوس کیا کہ دراصل نواب صاحب کو نہ اپنی نوابیت کی پرواہ ہے نہ عام مسلمانوں سے کوئی واسطہ ——— باوجود ملت کے کاموں میں اس قدر منہمک رہنے کے، اس سے اتنے علیحدہ اور اللہ سے اتنے قریب محسوس ہوتے تھے کہ عقل دنگ رہ جاتی تھی، عارف رومی کی زبان میں بارہا اس آرزو کا اظہار فرمایا تھا۔

یک دست جام بادہ و یک دست زلف یار
رقصِ چنیں میانۂ میدانم آرزوست

اور واقعی ایسی ہی جامعیت پیدا کر لی تھی کہ کبھی "زلف یار" ہاتھ سے چھوٹنے ہی نہ پاتی تھی۔

جس روز کلام پاک ختم ہوا، ایک صاحب نے عرض کی "نواب صاحب یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیئے؟ مرحوم فرمانے لگے:۔

"آپ کو یہ کیسے گمان ہو گیا کہ اب میں یہ سلسلہ ختم کر دوں گا۔ قرآن تو بار بار پڑھنے اور سمجھنے کی چیز ہے، اب کی دفعہ اس میں اور زیادہ لطف آئے گا اور انشاء اللہ یہ سلسلہ میری زندگی کے آخری لمحوں تک جاری رہے گا" ——— یہی ہوا، دوسرے ہی روز سے پھر تفسیر شروع ہوئی اور دوشنبہ ۳ رجب ۱۳۶۳ھ ہجری کی صبح تک

برابر جاری رہی — ہندوستانی مسلمان کو قرآن کا ایسا شیدائی قائد اَب کہاں نصیب ہوگا۔

عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

# تعلیمات اقبال سے لگاؤ

اِقبال موجودہ صدی کے سب سے بڑے اسلامی مفکر، جن کی نظر مغرب کے چھوٹے نگوں کی ریزہ کاری سے باخبر اور اسلام کے حقیقی نور سے آشنا، جن کی فکر نے فلسفۂ مغرب کے سارے سمندر رکھنگال ڈالے لیکن کچھ نہ پایا اور جب اِسلام کے بحر حقیقت میں غوطہ زنی کی تو اعلیٰ ترین جواہر سے اپنا دامن بھر لیا۔ یہی دولت تھی جو وہ اپنے قافلہ میں لٹانا چاہتے تھے اور رعوت لٹا گئے لوگ ان کے کلام کی تفسیر برگسان ہیگل یا اور ایسے ہی دوسرے فلسفیوں کی بکواس سے کرتے ہیں حالانکہ "اسرار ورموز" کے پڑھنے والوں سے ان کی وہ دعا مخفی نہیں کہ "اے بار الہا! اگر میں نے کوئی بات قرآن سے ہٹ کر کہی ہو تو مجھے قیامت کے روز حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پابوسی سے

محروم رکھا ہے ـــــــ اسیطرح "ضرب کلیم" میں "ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام" جو نصیحت لکھی ہے اس میں اس کی کافی وضاحت ہے کہ اقبال فلسفہ کی وادی میں برسوں سرگرداں رہے لیکن کچھ ہاتھ نہ آیا، جو کچھ ملا وہ دینِ محمدی ہی میں ملا ـــــــ اِس اعتبار سے اقبال کی حالت بالکل اپنے مرشد رومی کی سی تھی ـــــــ مولانا روم بھی تو اپنے زمانے کے جلیل القدر فلسفی اور علوم عقلیہ کے ماہر تھے لیکن جب ان پر اِسلام کے حقائق کھلے ہیں تو فلسفہ کی تار و پود بکھیر دی اور حرف حرف سے اِسلامی تعلیمات کی عظمت کا اِظہار ہونے لگا، اِقبال نے اپنے اِس پوزیشن (مقام) کو خود واضح کیا ہے۔

چو رومی در حرم دارم اذانِ من
ازو آموختم اِسرارِ جانِ من
بہ دورِ فتنۂ عصرِ کہن اُو
بہ دورِ فتنۂ عصرِ روان من

(ارمغان حجاز)

مرحوم محمد بہادر خاں اِقبال کی اِس جامعیت سے خوب آگاہ تھے اُن کے کلام کا غائر مطالعہ فرمایا تھا، قرآن و حدیث کی کسوٹی پر اُسے پرکھ چکے تھے اور چونکہ اس میں مسلمانوں کے مرض کی صحیح تشخیص اور اس کے علاج کی اعلیٰ تجویز پاتے تھے اِس لئے اسے اِنقلاب کا صحیح آلہ تصور فرماتے تھے ـ مرحوم کی محبت اور اقبال سے عقیدت کا اس سے اندازہ لگائیے کہ اکثر فرماتے۔

"کسی کا ہادی کوئی اور ہو تو ہو میرا ہادی اِقبال ہے۔"

مرحوم فرماتے تھے کہ وہ مغرب زدہ اذہان جو اسلام کے براہ راست مطالعہ سے گریز کرتے ہیں، وہ اگر اس مغرب دیدہ اور اسلام فہمیدہ کے کلام کو

پڑھ لیں تو انہیں تعلیمات اسلامی کی عظمت کا اندازہ ہو جائے گا، اور پھر خود اسلامی حقائق کو جاننے اور سمجھنے کی فکر کرنے لگ جائیں گے۔ اسی نقطۂ نظر سے مرحوم نے "بیت الامت" میں ہر ہفتہ درس اقبال کا سلسلہ جاری فرمایا تھا، جس میں پڑھے لکھے نوجوان شریک رہتے تھے، ویسے شرکت کی عام اجازت تھی۔

**درس اقبال**

مرحوم نے "درس اقبال" کے لئے بہترین اساتذہ کا انتخاب فرمایا تھا؛ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور مولوی غلام دستگیر رشید اور خود مرحوم درس دیا کرتے تھے، طرز یہ تھا کہ ہر ہفتہ جمع تو سب ہی ہوتے لیکن کوئی ایک پڑھتا جاتا اور اس کی تشریح کرتا جاتا تھا، جہاں کوئی بات تشنہ رہ جاتی یا کسی کے ذہن میں کوئی اور مفہوم ہوتا تو اس کا اظہار کر دیا جاتا اور اس میں اساتذہ کی تخصیص نہ تھی بلکہ سامعین بھی حصہ لے سکتے تھے ـــــ بالعموم یہ ہوتا کہ تمام اساتذہ کلام کے فلسفیانہ پہلو پر روشنی ڈالتے اور مرحوم اس کی قرآنی توجیہہ فرماتے ـــــ اس درس کی حقیقت ڈاکٹر رضی الدین سے سنیئے:۔

> "سچ پوچھئے تو جس درس میں وہ (قائد ملت) شرکت کرتے، اس کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا تھا، حاضرین ایک کیف و سرور سے سرشار ہو کر نکلتے تھے۔ بقول ان کے جب وہ اقبال کے کسی شعر پر "نمک مرچ" لگانا شروع کرتے اور بات میں بات نکلتی جاتی تو دنیا بھر کے مختلف مسائل پیش نظر ہو جاتے ـــــ اقبال کے کلام کا ایسا مطالعہ شاید کیا یقیناً کہیں اور نہیں ہوا ہوگا۔ مرحوم خود اقبال کی تعلیم اور ان کی تمناؤں کا مجسم نمونہ تھے اور درس اقبال کے وقت جب

وہ نظروں کے سامنے ہوتے تو پھر اقبال کے بہت سے
اشعار از خود واضح ہو جاتے تھے اور ان اشعار میں ایک
نیا لطف محسوس ہونے لگتا تھا۔" (تنظیم۔ قاید ملت نمبر)

مرحوم کے عمیق مطالعہ قرآن و حدیث کا نتیجہ یہ تھا کہ باوجود تیاری کی فرصت نہ ملنے کے جب درس اقبال میں شریک رہتے تو اشعار کی تائید میں بلا تکلف آیتیں اور احادیث پیش فرماتے چلے جاتے تھے۔ ——— مرحوم کے انداز تفہیم کو سمجھنے کے لئے ایک مثال پیش ہے:۔

اقبال کی مشہور مثنوی "اسرار خودی" پڑھی جا رہی تھی، یہ شعر آیا:

طبع مسلم از محبت قاہر است
مومن ار عاشق نہ باشد کافر است

ڈاکٹر رضی الدین فرمانے لگے:" نواب صاحب یہاں تو اقبال نے شاعری کی ہے، اتنا سخت فتویٰ، میں نہیں سمجھتا کہ دیا جا سکتا تھا، شاید اس کا کوئی ثبوت قرآن میں نہیں ملتا۔"

نواب صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا:" جی نہیں ڈاکٹر صاحب اقبال کوئی بات قرآن سے ہٹ کر نہیں کہتے، دیکھئے آیت شریف ہے، والذین آمنوا اشد حبا للّٰہ۔ (جو مومن ہوتے ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ سے اشد محبت ہوتی ہے)" پھر اس کی تائید میں یہ حدیث شریف پیش کی ہے ——— لا یومن احدکم حتیٰ اکون احب الیہ من والدہٖ وولدہٖ والناس اجمعین۔" (بخاری باب حب الرسولؐ من الایمان)
یعنی تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میری ذات اس کے نزدیک اس کے والد اور اولاد اور تمام انسانوں سے محبوب تر نہ ہو جائے۔

اَب بتایئے کیا واقعی اقبال نے محض شاعری کی ہے یا اس میں حقیقت بھی ہے؟ مرحوم کی اقبال فہمی میں کیا کلام ہوسکتا ہے، علامۂ اقبال کی حیات میں "اقبال کا تصورِ مومن" پر تقریر کرتے ہوئے خود ان سے داد حاصل کی تھی، پھر ان کے قوی حافظہ نے کلامِ اقبال کا کافی ذخیرہ محفوظ کر رکھا تھا جس سے دورانِ تقریر بہت فائدہ اٹھاتے تھے، اشعار اس موزونیت کے ساتھ لاتے کہ اِن سے تقریر کا اثر بڑھ جاتا اور تقریر سے ان کی صحیح ترین توجیہہ ہوجاتی:

اِقبال کے بعض اشعار پر مرحوم نے مستقل تقریریں کی ہیں۔ مثلاً چند اشعار درج ذیل ہیں:۔

(۱) یہ عقل جو مہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار
شریکِ شورشِ پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خرد نے کہہ بھی دیا لَا اِلٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

---

(۲) محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج دِل پریشاں سجدہ بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

---

(۳) ہر کہ عشقِ مصطفےٰ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست ــــ وغیرہ وغیرہ

اِقبال کے کلام کی روانی، اس کے زور اور بے ساختگی کا کمال انہی مقامات پر ملتا ہے جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی منقبت ہوتی ہے، عاشق رسولؐ بہادر خاں کے لئے ان مقامات میں کتنی جاذبیت نہ ہوگی؟ توضیح تو الگ رہی جب مرحوم ایسے اشعار صرف پڑھتے ہوتے تو عجیب کیفیت طاری ہو جاتی، خود بھی اثر میں ڈوب جاتے اور دوسروں کو بھی متاثر کر دیتے تھے، یہ چند اشعار تو مرحوم کے وردِ زبان ہو چکے تھے:۔

(۱) دردِل مومن مقام مصطفیٰ ست
آبروئے ما ز نام مصطفیٰ ست

---

(۲) آشکارا دیدنش اسرائے ما
در ضمیرش مسجد اقصائے ما

---

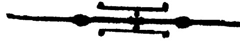
(۳) بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

---

مرحوم کی زبانی کلام اقبال کا کیا تذکرہ کیا جائے کہ خود مرحوم مجسمہ تھے اقبال کی تمناؤں اور آرزوؤں کا، کیسی بلند نگاہ کیسا دلنواز سخن اور کتنی پرسوز جان تھی، طبع کیسی ارفع اور مشرب کتنا اعلیٰ پایا تھا، عزائم کس قدر اونچے اور ارادے کتنے مصمم تھے، لیکن حیف صد حیف۔

ع -
بوئے گل سیر نہ دیدم و بہار آخر شد

مگر شکر ہے کہ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اور مولوی غلام دستگیر صاحب رشید نے درس کا یہ سلسلہ جاری رکھا ہے اور لوگ مستفید ہو رہے ہیں -



# اسلامی نظام معیشت کی کمیٹی

مرحوم کا آخری بنیادی کام "اسلامی نظام معیشت" کی تدوین تھا؛ اشتراکیت کی بڑھتی ہوئی بپٹ سے سیکڑوں مسلم نوجوان مجروح ہو چکے ہیں، ان کی نظریں روس کی نظارہ بازی میں حیران ہیں — ادھر داعیین اسلام کا یہ عالم کہ یا تو محض اشتراکیت پر لعن طعن کرتے ہیں، یا صرف اپنے مذہب کی تحسین میں حلق خشک کرتے ہیں، یہ چیز عام مسلمانوں کو تشفی ہرگز نہیں بخش سکتی، اسی ضرورت کے پیش نظر مرحوم نے "اسلامی نظام معیشت" کو ایک مکمل نظام کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ اپنی وفات سے تقریباً ڈیڑھ سال قبل ہی سے خود اشتراکیت اور دوسرے معاشی و سیاسی نظریوں کا بغور مطالعہ اور ان کا اسلامی نظام سے مقابلہ فرما رہے تھے، لیکن یہ کام ایسا نہ تھا جو کسی ایک ہستی کی کاوشوں سے پورا ہو سکتا، پھر ایک جماعت کا کام زیادہ

مستحکم ہو سکتا ہے ۔ فرد واحد کے کام سے ۔ ان چیزوں کے پیش نظر مرحوم نے ملک کے ماہرین کی تین مختلف کمیٹیاں بنائیں۔

(۱) ایک کمیٹی اسلامیات کے ماہرین کی تھی جس میں حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی اور مفتی عبدالرحیم صاحب وغیرہ تھے۔

(۲) دوسری کمیٹی معاشیات کے ماہرین کی تھی، اس میں ڈاکٹر انور اقبال قریشی اور پروفیسر عبدالقادر صاحب کے علاوہ بعض اشتراکیین بھی تھے۔

(۳) تیسری کمیٹی ان لوگوں پر مشتمل تھی جو ان دونوں کے بین بین ہوں اور دونوں سے علیحدہ علیحدہ بحث مباحثہ کر کے ان میں ربط پیدا کریں اور دونوں کی تحریروں کا تفصیلی تجزیہ کر کے یہ واضح طور پر بتلائیں کہ جدید تحریکوں میں جو عمدہ اصول ہیں وہ بدرجۂ اتم اسلام میں پائے جاتے ہیں۔۔۔ اس کمیٹی میں خود مرحوم اور ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، مولوی غلام دستگیر صاحب رشید وغیرہ تھے۔

اس سلسلہ میں کمیٹی کے کاروبار کے تمام اخراجات مرحوم نے اپنے ذمہ لے رکھے تھے، اس کام سے ان کی دلچسپی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ فرماتے تھے:

"اگر یہ کام میری زندگی میں تکمیل پا جائے تو میں سمجھونگا کہ میں نے ایک بڑے فرض سے سبکدوشی حاصل کر لی" لیکن اس مقام پر قرآن مجید کا وہ ارشاد یاد آتا ہے:" اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی "۔۔۔۔ کیا انسان کے لئے ہر وہ چیز ہے جس کی وہ تمنا کرے؟' یہی ہوا' مرحوم چل بسے اور کام دھرا رہ گیا

ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

لیکن توقع ہے کہ مرحوم کی یہ نیک تمنا پوری ہو کر رہے گی۔

بہرحال چونکہ کمیٹی کا کام تکمیل پانے کے لئے کافی عرصہ درکار تھا، مرحوم نے

اپنی سحر بیانی کو بھی اس مقصد کے لئے استعمال فرمایا۔ "اسلام اور اشتراکیت" کے عنوان پر کئی پر مغز اور مدلل تقریریں کیں اور آئندہ تقاریر کے لئے بھی اسی عنوان کو مختص فرمالیا تھا، توقع تھی کہ ان حقائق نواز اور اثر آفریں تقریروں سے ان مریض اذہان کا علاج ہو جائے گا، جو غلط علاج کا شکار ہو چکے تھے لیکن خدا کو منظور نہ تھا، محمد بہادر خاں بلالئے گئے۔

وائے بر قسمتِ مسلمانانِ ہند!



# محمد بہادر خاں بحیثیت مُصلح

آج کل قوم کی اصلاح کی فکر ہر اہل و نااہل میں یکساں پیدا ہو چکی ہے، غالباً ہماری قوم کی سب سے بڑی بدبختی یہی ہے کہ ہر ایک مصلح بننے کی فکر میں ہے، ہر ایک خادم قوم کہلانے کا خواہاں ہے جس ملک میں وبا عام ہو چکی ہو اور ہر مریض طبیب بننے کی کوشش کر رہا ہو تو اس کا مستقبل ظاہر ہے! ہر فرد تو کیا مصلح بن سکتا ہے، ہر عالم و فاضل بھی اِس منصب کے لئے موزوں ثابت نہیں ہو سکتا مثل مشہور ہے کہ :-

ع "نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند"

کیا یہ مشاہدہ نہیں کہ ہر فاضل اپنے فن کا اچھا پروفیسر ثابت نہیں ہوتا؟ کیا علم کے علاوہ ایک اور صلاحیت بھی ضروری نہیں تاکہ افادہ کی قوت پیدا ہو سکے؟ اور جب علم کی اشاعت ہر ایک کے بس کی بات نہیں تو اصلاح و تربیت تو اور بھی

مشکل کام ہیں اور یہ بغیر چند خاص صلاحیتوں کے ممکن ہی نہیں جن کا تعلق حصول سے نہیں عطا سے ہے، اللہ تعالیٰ جس کسی کو چاہیں سرفراز کریں! ایسی صورت میں ہر فرد کا اس مقام کے حصول کی کوشش کرنا نہ صرف فعل عبث بلکہ قوم کے حق میں انتہائی مضر ہے!

غور کیجے تو کتنی مثالیں، گذرے ہوؤں کی نہیں، زندوں کی، ایسی ملتی ہیں کہ انھوں نے تعمیر کی ٹھانی اور تخریب کا باعث بن گئے، قوم کو ٹھوکر کھانے سے بچانے کی کوشش کی اور گڑھے میں لاگرایا۔ نہ عقل ایسی اصلاح کی تائید کرتی ہے نہ شریعت اس کو روا رکھتی ہے، شریعت اسلام نے تو صاف طور پر واضح کر دیا کہ اگر چھوٹی برائی کو روکنے سے بڑا خطرہ لاحق ہو رہا ہو تو اس سے انجان رہنا ہی بہتر ہے۔ کتنے ہمدردان ملت نے بدعات کو رد کرنے کی کوشش میں، عقیدہ کی اصلاح کی فکر میں فرقہ بندی اور نفاقِ ملت کے نتائج پیدا کئے، کیا اسی کا نام اصلاح ہے؟——

حقیقت یہ ہے کہ "نہی عن المنکر" کا ایک خاص طریقہ ہوتا ہے، اگر اس سے ہٹ کر اصلاح کی کوشش کی جائے تو بجائے فایدہ کے نقصان پہنچنا ضروری ہے۔ اُصول طب کو نظر انداز کر کے اگر دواؤں کے خوراک کے خوراک پلائے جائیں اور خواہ وہ دوائیں کتنی ہی مقوی کیوں نہ ہوں، مریض قریب المرگ نہ ہوتا جائے گا تو اور کیا ہوگا؟ خدا ہماری قوم کو ایسے طبیبوں سے بچائے۔

## انفرادی حیثیت سے اصلاح

مرحوم محمد بہادر خاں نے اصلاح کی کوشش کی، صحیح اُصولوں پر کام کرتے رہے اور سب نے دیکھا کہ صدہا مریض شفایاب ہوئے۔ مرحوم کی تقریروں سے غیر شعوری طور پر ہزاروں افراد کے عقیدوں کی اصلاح ہو گئی سیکڑوں بدعتی، فضول رسوم اور غیر اسلامی رواج سے کنارہ کش ہو گئے۔ وجہ یہ تھی کہ مرحوم کبھی یہ نہ فرماتے کہ انسان پرستی ترک کر دو،

قبر پرستی چھوڑ دو، منتوں اور چڑھاؤں سے احتراز کرو کیونکہ یہ مشرکانہ حرکات ہیں، بلکہ یوں فرماتے کہ مسلمان جب الوہیت کا اقرار کر چکتا ہے تو پھر اس کی ہر تمنا کا منتہا ہر آرزو کا منبع صرف ذات الوہیت ہی ہو جاتی ہے، اُسے غیر اللہ سے مانگتے ہوئے شرم آنے لگتی ہے اور جب وہ ایک نہ بغیر کسی واسطہ کے ہر ایک کی فریاد سنتا ہے تو بچاسوں کی خوشامد سے کیا حاصل۔ اس طرح کے جملے ہوتے ان کی قرآن و حدیث سے توضیح کی جاتی، اللہ والوں کی سیرتوں سے نظیریں پیش کی جاتیں اور خود بخود لوگوں کو اپنے کئے پر ندامت ہوتی اور اس سے احتراز کرنے لگتے تھے۔ حق پیش کرنیکا یہی صحیح طریقہ ہے جس سے نہ تفرقہ اندازی کا اندیشہ ہے، نہ برے اعمال پر ضد پیدا ہونیکا امکان۔ کوئی شخص صرف عصائے کلیمی پھینک کے دیکھے کہ کس طرح وہ باطل کے ہر اژدہا کو ہضم کر جاتا ہے یہ کیا ضروری ہے کہ چیخ و پکار کی جائے کہ یہ سانپ بڑے خطرناک ہیں ان کو ختم کر دینا چاہیئے —— مرحوم کے اسی طرز اصلاح کا نتیجہ تھا کہ سیکڑوں راہ گم کردہ، حقیقت توحید سے آگاہ ہو گئے اور بیسیوں دوکانداروں کی دوکانیں بیٹھ گئیں، یہ مبالغہ نہیں واقعہ ہے اور ایک بین حقیقت!

یہ تو بھٹکے ہوؤں کے لئے تھا، جو سرے سے اس راہ ہی پر نہ چلتے تھے اور اسلام پر ہنستے تھے ان کا علاج یوں فرمایا کہ ان کے معتقدات (چاہے کسی معاشی تحریک کی شکل میں ہوں یا سیاسی نظریہ کی صورت میں) کے مقابل اسلامی حقائق رکھے۔ دونوں کا منصفانہ تقابل کیا، تاریخ اسلام سے اپنی تائید میں ثبوت فراہم کئے اور حالات حاضرہ سے ان کی عملی قباحتوں کو واضح کیا اور اس طرح ثابت کر دکھایا کہ ہر قسم کی فلاح و صلاح اسلام ہی میں موجود ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ سرمایہ داریت سے مخمور سیکڑوں دماغ اور اشتراکیت سے مسحور پچاسوں اذہان اپنی آلائشوں سے پاک ہو گئے اور اسلامی تنویر کے قائل ہو گئے —— کیا دوسرے نظاموں

اور نظریوں پر محض پھبتیاں کسنے اور اپنے نظام کی بے دلیل تعریف کرنے سے یہ چیز حاصل ہوسکتی ہے؟ کیا ایسی صورت میں اس بڑے خطرہ کا اندیشہ نہیں کہ لوگ محض کہنے والے کی کم علمی کو اسلام کی تہی دامنی پر محمول کرنے لگیں؟ اگر یہ صحیح ہے تو اس کی ذمہ داری کس پر رکھی جائے؟ انہی نااہل مصلحوں پر ان ہی بیمار طبیبوں پر۔

**اجتماعی حیثیت سے اصلاح** | اتحاد: کسی قوم کی بقاء کا راز، اس کی ترقی کا ضامن ——— مسلمانوں کے اتفاق و اتحاد کو تو اللہ تعالیٰ نے اپنے احسانوں میں سے بتایا ہے کہ اسی نے مسلمانوں کو اس دولت سے بہرہ ور کیا ورنہ وہ تباہ ہو جاتے (وکنتم علیٰ شفا حفرۃ من النار فالف بین قلوبکم الخ) ——— مسلمانوں کی اس بے بہا دولت کے لٹ جانے کا رنج بہت سوں کو ہے اور ہر ایک اس کے حصول کی کوشش میں لگا ہوا ہے، ہر ایک اپنی بساط کے موافق خاکے بناتا ہے اور اسی کو صحیح ترین سمجھ کر سارے مسلمانوں کو اس راہ پر چلنے کی دعوت دیتا ہے ——— پنجاب کا خطہ اس خصوص میں سب سے پیش پیش ہے۔

اس سے بڑھکر اور کیا بدبختی ہوسکتی ہے کہ قوم کا بندھا بندھایا شیرازہ یہ کہہ کر بکھیرا جا رہا ہے کہ ہم ہی صحیح مصلح اور ہماری ہی قیادت میں مسلمانوں کی فلاح مضمر ہے، ہم بے نفس ہیں دوسرے خود غرض! کیا یہ ممکن نہیں کہ تمام مصلحین اپنی اپنی اصلاح کے دائرے قایم رکھتے ہوئے ایک مرکز کے تحت مجتمع ہوجائیں، کوئی ملت کے مذہبی پہلو کا معالج ہو، کسی کے ذمہ معاشی کمزوری کا علاج ہو، اور جو سیاسی نقص کو دور کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہے، اسے اپنے دائرہ عمل میں آزاد رکھیں؟ کیا اس سے فرقہ بندی کا قلع قمع نہ ہو جائے گا؟ کیا اس سے مسلمانوں کی ہر جہتی فلاح کی صورت پیدا نہ ہو جائے گی؟ لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ ہر ایک معالج بجائے

پنے اپنے فن میں کام کرنے کے ہر مرض کا ماہر بن کر پیش ہونا چاہتا ہے؟ ہر ایک دعویٰ ہے "خادم قوم" ہونے کا اور نیت ہے "مخدوم ملت" بننے کی؟ پھول ن کر جھکنے کی آرزو سب پالے ہوئے ہیں لیکن کھاد بن کر نہال ملت کی تقویت کا باعث بننا کسی کو گوارا نہیں اور اس کے باوجود ہر ایک کو اپنی بے نفسی کا عویٰ اور دوسرے کی خود غرضی کی شکایت ـــــ افسوس ایسی قوم پر اور یسے مصلحین پر۔

بعضوں نے یہ کہہ کر جماعتیں قایم کرلیں کہ مسلم لیگ میں گذر رہی ہونا شکل ہے؟ مسلم لیگ سیاست میں غلو کر چکی ہے، ہم مسلمانوں کو مذہب کی طرف لانا چاہتے ہیں ـــــ مرحوم قایدِ ملت کی زندگی اور ان کا عمل ان تمام مدعیوں کے دعوں کی اصلیت کو واضح کر دیتا ہے، مرحوم بھی تو آخر اس بات کو محسوس کرتے تھے کہ مسلم لیگ سیاسیات میں غلو کر چکی ہے، مذہب کا پہلو نظر انداز کر دیا جا چکا ہے، لیکن ان کو اس کا بھی احساس تھا کہ مسلمان اس مرکز کے تحت مجتمع ہو چکے ہیں اور سیاست کی رہنمائی کی باگ جن ہاتھوں میں ہے وہ صحیح ترین ہیں، اس لئے انھوں نے اتحاد کو بغیر نقصان پہنچائے وہ کام کیا، جس کا دعویٰ کرکے لوگ انتشار پیدا کر رہے ہیں ـــــ پھر مرحوم کی حیثیت کیا تھی؟ دکن کے اس طبقہ سے تعلق تھا جو عوام کے نزدیک مطعون اور قومی اعتبار سے مفلوج عضو تھا، پھر یہ کیا بات تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے عوام میں اتنی مقبولیت حاصل ہو گئی کہ ہندوستان بھر کے مسلمان ان کی باتیں شوق کے کانوں سننے لگے؟ کیا کوئی جماعت بنائی تھی؟ بے نفسی کا دعویٰ کیا تھا؟ اگر نہیں تو پھر ہزاروں کی اصلاح کیسے ہو گئی؟ بے نمازی نمازی کیسے بن گئے؟ فیشن پرستوں کو مولوی بننے کا کیوں شوق پیدا ہو گیا؟ مسلم لیگ کی خالص سیاسی جماعت میں مذہب کی لہر کیسے دوڑ گئی اور سب سے بڑھ کر

یہ کہ ایسے مذہبی شخص کو ان نرے نیتا سوں نے اپنی محفل میں آنے کا موقع ہی کہاں دیا؟ ــــ وہ حق ہی کیا جو باطل پر چھا نہ جائے، وہ نور ہی کیا جو ظلمت کے گوشوں کو منور نہ کر دے! مرحوم میں صداقت تھی، مذہب کا پاس تھا، ملت اسلامیہ کا صحیح درد تھا، خالق کل کی رضا جوئی منظور تھی، نہ قیادت کی تمنا تھی، نہ شہرت کا خیال تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ جدھر بڑھے اور جس سمت نکل گئے کوئی قوت روک نہ سکی اور ہر جگہ مذہب کا رنگ جما کر رہے، نہ کسی پارٹی بندی کی ضرورت لاحق ہوئی نہ متحدہ ملت میں کوئی رخنہ آنے پایا بلکہ اتحاد اور بڑھ گیا۔ اب ہندوستان کے شمال مغربی گوشہ سے یہ صدا بلند نہ کی جائے کہ ہم مذہبی حیثیت سے مسلمانوں کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں اور لیگ میں رہ کر ہی کرتے لیکن کیا کریں کہ وہاں ہماری کوئی شنوائی ہی نہیں ہوتی؟ اسی لئے ہم الگ جماعت بنانے پر مجبور رہیں، ــــ اگر اتنی صلاحیت نہیں کہ کسی جماعت میں رسوخ ہی حاصل کر سکیں تو اصلاح قوم کا اتنا بڑا دعویٰ کب زیب دیتا ہے؟! یہ کیوں نہیں کہہ دیا جاتا کہ ہم اپنی انفرادیت کی خاطر ملت کے اتحاد کو قربان کرنے تیار رہیں؟

# "کیا پوچھتے ہو کہ کیسے کھو دیا"

(از حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ)

الحمد للہ وکفی باللہ والصلوٰۃ والسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

نواب بہادر یار جنگ مرحوم سے فقیر کی واقفیت کی ابتداء اس زمانہ سے ہوئی، جب وہ دارالعلوم فوقانیہ میں میٹرک کی تعلیم حاصل کر رہے تھے یہ حیدرآباد کا ایک خاص تاریخی عہد تھا، قدیم حیدرآباد عہد عثمانی کے ہر جہتی برکات کے زیر اثر جدید حیدرآباد کا چولا آہستہ آہستہ بدل رہا تھا، یا بدلنے کا ارادہ رکھتا تھا!

حیدرآباد اس وقت کیا تھا؟ اسی سے اندازہ کیجئے کہ سب سے بڑے کامیاب خطیب اس وقت کے مولوی عبدالقادر صاحب صوفی تھے، جن کے مواعظ مسئلہ وحدت الوجود پر بڑے دھوم دھام سے تقریباً ہر جمعہ چوک کی مسجد میں ہوا کرتے تھے، پبلک کا عام مذاق اسی قسم کے مضامین سے دلچسپی رکھتا تھا۔

دوسری طرف مولود خوانی کا ایک باضابطہ نظام حیدرآباد میں قایم تھا، جب ساری دنیا کھا پی کر سونے کے لئے اپنے اپنے بستروں پر دراز ہوجاتی تھی، تب رات کے اسی ڈراؤنے سناٹے میں، شہر کے مختلف محلوں اور محلوں کی مختلف گلیوں میں، گلیوں کے مختلف گوشوں سے انتہائی کرخت اور سمع خراش بلند آوازوں میں آٹھ آٹھ دس دس آدمی ایک ساتھ چیختے تھے "چیخ" کے سوا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ آخر وہ کیا پڑھ رہے ہیں —— اگرچہ بظاہر حیدرآباد ان ہی حالات میں مگن تھا، لیکن حیدرآباد سے باہر جن تحریکوں کا طوفان برپا تھا، اندر اندر دکن کے باشندوں کو بھی متاثر کر ہی رہا تھا، پہلی دفعہ کھل کر مسلمانان دکن کو اپنے دبے دبائے جذبات کے ابھارنے اور دکھانے کا موقعہ اِس عظیم الشان جلسہ میں ملا جسے خلافت کا جلسہ کہتے ہیں۔ بس اسی جلسہ سے عوامی تقریروں کا رُخ بدلنے کا آغاز ہوتا ہے، اسی کے ساتھ بتدریج راتوں والی میلاد خوانی کی جگہ میلاد کی منظم و پرشوکت مجلسوں نے لے لی، جن میں سیرت طیبہ محمدیہ صلی اللہ علی صاحبہا کے مختلف پہلوؤں پر بڑے اچھے اچھے خطیب تقریر کرنے لگے، اور سچ پوچھئے تو خلافت کی مجلس کے ختم ہونے کے بعد اہنی میلادی مجلسوں میں وہ سب کچھ کہا جانے لگا جس کے کہنے کی ضرورت اس زمانہ میں مسلمانوں کو تھی، اہنی سنئے تقریر کرنے والوں میں ایک مقرر خاکسار بھی تھا۔

نواب بہادر یار جنگ "بہادر خاں" متعلم دارالعلوم کے نام سے ان مجلسوں میں بالالتزام شرکت کرتے تھے، اِن مجلسوں میں ان کو اکثر اپنے آگے اپنے پیچھے، دائیں بائیں پاتا تھا، جو چیز ان کی پچھلے دنوں میں ڈیل ڈول بن گئی تھی، کم عمری کے زمانہ میں اسی کی وجہ سے وہ ایک بے ڈول سے آدمی نظر آتے تھے، —— یہ کون ہیں، ان کو عموماً اپنے آگے پیچھے، دائیں بائیں خصوصاً

تقریر وخطابت کی مجلسوں میں کیوں پاتا ہوں؟ میرا دل کبھی کبھی اس سوال کو
ٹھاتا اور پھر خاموش ہو جاتا۔ آخر ایک دن میں نے ان کو پایا کہ وہ میری اقامت گاہ
ہو اس وقت جام باغ ترپ بازار میں تھی تشریف لائے، "میرا نام بہادر خاں
ہے، اور دار العلوم فوقانیہ کا طالب علم ہوں آپ کی تقریروں سے دلچسپی رکھتا
ہوں، اس لئے ملنے آیا ہوں"۔ اس تعارف کے بعد وہ کبھی کبھی تشریف لاتے
رہے، لیکن یہ کبھی نہیں کھلے کہ حیدر آباد کے امراء اور ارباب مناصب کے
کسی خانوادہ سے ان کا تعلق ہے۔ مجھے زندگی بھر اس کا افسوس رہا کہ جب تک
انھوں نے اپنی زندگی کے اس پہلو سے ناواقف رکھا، اس وقت تک میرا
برتاؤ ان کے ساتھ بس اس سے زیادہ نہیں تھا، جتنا کہ کالج کے کسی استاذ
کا، اسکول کے کسی طالب علم کے ساتھ ہوسکتا ہے۔ اب ان سے تعلقات
بڑھتے چلے گئے، "آپ کو دار العلوم کے مدرسہ میں تکلیف کرنی پڑے گی" ایک
دن یہ حکم لے کر تشریف لائے۔ دار العلوم سے میرا کیا تعلق؟ میں نے عرض کیا
مرحوم نواب نے فرمایا چونکہ اس مدرسہ سے میرا تعلق ہے، آپ کے تعلق کے
لئے کیا یہ کافی نہیں؟ کہنے لگے 'وہاں' کی بزم میں تقریری مقابلہ ہے۔ آپ کو
حکم بنا کرلے چلتا ہوں۔ اس سے پہلے نواب مرحوم کی کسی تقریر کے سننے کا موقع
نہ ملا تھا، اور اس زمانے کے بھاری بھرکم بے ڈول جسم کو دیکھ کر مجھے توقع بھی
نہ تھی کہ یہ کوئی اچھی تقریر کر سکیں گے، بہر حال ان کی فرمائش کی تعمیل سے
گریز کی کوئی راہ نہ تھی۔ دار العلوم حاضر ہوا۔ مقابلہ کے میدان میں مقابلے
والے اترتے رہے، میٹرک کلاس کے طلبہ جیسی تقریر کر سکتے ہیں عموماً ان میں
سب کی تقریروں کا معیار بس اسی قدر تھا، آخر میں اس چوڑے جسم چکلے
سینے کے ساتھ "بہادر خاں طالب علم" بھی آگے بڑھے، تقریر شروع ہوئی،

لیکن پہلا، دوسرا، تیسرا لفظ اِس بھاری بھرکم فربہ جسم والی زبان سے نکل کر ابھی شاید کوئی فقرہ بھی نہ بننے پایا تھا کہ اچانک توقع کی گذشتہ سطح میں ہلچل پیدا ہوئی، کان کھڑے ہو گئے، دماغ چوکنا ہوکر بیدار ہو گیا، دل اُٹھ بیٹھا، میں کیا سن رہا ہوں؟ کس سے سن رہا ہوں؟ " دکن کے مطلع سے خطابت کا آفتاب طلوع ہو رہا ہے" ایسا معلوم ہوا کہ کسی کشفی کیفیت میں یہ تماشا میرے سامنے اس وقت پیش ہو رہا ہے، اس وقت تک تو وہ کشف تھا، سونے کا تحفہ اپنے سحر سے مسحور کرنے والے کے گلے میں پہنایا، دعا دی اور انتظار کرتا رہا کہ میرا کشف مشاہدہ کی شکل کب اختیار کرتا ہے، دو برس بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ سکندر آباد کی میلاد کی مجلس میں نواب مرحوم بحیثیت خطیب اعظم کے شریک ہونے لگے، پھر تو غلغلہ ان کی تقریر و خطابت کا بلند ہوا، اتنا بلند ہوا کہ سارے ہندوستان کو اپنے اثر کے نیچے لے آیا، اس کے بعد تو وہ بڑے ہوئے، بڑے ہوتے چلے گئے، اتنے بڑے کہ مجھے ان کے ساتھ چھوٹے ہونے کی بھی نسبت مجھے باقی نہ رہی۔ لیکن ان تمام بڑائیوں میں ایک بڑائی یہ بھی تھی کہ کسی زمانے میں چھوٹے بن کر میرے سامنے چونکہ آئے تھے اس لئے باوجود بڑے ہونے اور بڑے ہوتے چلے جانے کے، خلوت کی مجلس ہو یا جلوت کی، اس کا ضرور ذکر فرماتے تھے، اتنا کہتے کہ آج بھی اس کے تصور سے مجھے شرم آتی ہے لیکن جس چیز کے تصور سے شرم آتی ہے، برملا وہی وہ مجھے اور میرے ساتھ جو بھی اس وقت مجلس میں موجود ہوتے سب کو سناتے چلے جاتے تھے۔ بڑائی کے اتنے بلند مینار پر پہنچنے کے بعد اِن دنوں کو کون یاد رکھتا ہے جن میں وہ چھوٹوں کی زندگی گزارتا ہے! لیکن سچ یہ ہے کہ اس چھوٹے کو بڑا ان ہی چھوٹی چھوٹی

ہاتوں نے بنا دیا تھا، جن کا لوگ اکثر خیال نہیں کرتے، وہی چڑھائے جاتے ہیں جو اپنے آپ کو اتارتے رہتے ہیں من تواضع للّٰہ رفعہ اللّٰہ (اللہ کے لئے جو جھکتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے اونچا کرتے ہیں) اس راز کی رازشناسی ہر ایک کی قسمت میں نہیں ——

آخر چھوڑ چھوڑ کر جانے والوں میں کتنے ہیں جو چلے گئے، اور مسلسل چلے جا رہے ہیں، لیکن ان چھوڑ کر جانے والوں میں ایسا کون تھا یا ایسا کون ہے، جس کے جانے کے بعد کہنے والوں کی ایک بڑی جماعت کہہ رہی ہے، متفقہ آواز کے ساتھ کہہ رہی ہے کہ ہم گونگے ہو گئے اس لئے کہ ہماری زبان ہی چپ ہو گئی، اب ہم بہرے ہیں کہ جس سے خطرہ کی ہر آواز کو ہم سنتے تھے ہمارا وہ کان ہی بند ہو گیا۔ ہم کچھ سوچ نہیں سکتے کہ ہمارا دماغ ہی سو گیا، ہم اب کیا اٹھیں گے جب دل ہی اپنا بیٹھ گیا ——

کسی گھر یا محلے یا شہر یا تعلقہ کے باشندوں کی یہ آواز نہیں ہے، یہ ماتم ہے بہادر یار جنگ غفر اللہ لہٗ کا، جو برپا ہے ہفتوں سے ہر اس مسلمان کے گھر میں جو ہندوستان میں رہتا ہے، اس ملک میں رہتا ہے، جہاں کے رہنے والے طے کر رہے ہیں کہ اس ملک میں صرف ان ہی کو رہنے دیا جائیگا، جن کا یہ استھان ہے، مگر ان سے جب کہا جاتا ہے کہ پھر اسی ملک کا دوسرا استھان ہی دو جس میں ہم رہیں، تو وہ اس پر بھی راضی ہوتے ہوئے نظر نہیں آتے ——

عالم اسلام جس کے لئے رو رہا ہو، دکن رو رہا ہو، اس کا وطن رو رہا ہو، سی پی میں جس کے ماتم کی صف بچھائی گئی، اور یو پی میں جس پر آنسو بہائے گئے، اُف جس کے لئے مدراس چیخ رہا ہے، بمبئی والے ڈھاڑیں مار رہے ہیں، بہار کے

باشندے کپڑے پھاڑ رہے ہیں، سندھیوں میں جس کا نوحہ پڑھا جا رہا ہے، پنجاب میں غم کا طوفان جس کے بعد اُٹھا اور کشمیر اور سرحد والوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہوا ـــــ کیا پوچھتے ہو کہ اس کو کھو کر مجھ جیسے بے کس انسان نے کسے کھو دیا۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

انچہ من گم کردہ ام، گر از سلیمان گم شدے
ہم سلیمان، ہم پری، ہم اہرمن بگریستے

تسلی جو کچھ بھی ہے وہ صرف اسی سے ہی کہ

غداً القیٰ الاحبہ
محمداً وحزبہ

انشاء اللہ اسی حزب میں دوسروں کے ساتھ ہم اس کو بھی پالیں گے، جسے آج کھو بیٹھے ہیں، حسبی اللہ ونعم الوکیل۔

تمت

نصیر الدین کاتب